ایران کے دن

ایران کا سفرناما

الطاف شیخ کی اپنی ویب سائیت

www.altafshaikh.com.pk

الطاف شیخ

سفر سے متعلق اہم باتیں

ایران ہمارا ہمسایہ ملک ہے اورپاکستان کے صوبے بلوچستان سے ملا ہوا ہے۔کئی لوگ کوئٹہ سے بائی روڈ تہران جاتے ہیں اور ایران کا شہر زاہدان ایسے ہے جیسے انڈیا کا امرتسرکہ پاکستان کا بارڈر پارکرتے ہی آدھ گھنٹے میں انسان وہاں جا پہنچے۔ پھر جی ٹی روڈ سے امرتسر، جالندھر، لدھیانہ، انبالہ،کرنال، پانی پت جیسے شہروں سے ہوتا ہوا انڈیا کے دارالحکومت دہلی جانکلے۔ دوسری جانب کوئٹہ سے چلنے والی بس پاکستان کا بارڈر پارکرتے ہی زاہدان، بم، یزد، کاشان اور قم ہوتی ہوئی تہران جانکلتی ہے۔ اسی طرح ایران کی مشہور بندرگاہ "چھابہار" بھی پاکستان کے بارڈر سے ملی ہوئی ہے۔ جس طرح انڈیا کی جانب گجرات کی بندرگاہ "پھوربندر" ہے۔ ایران کی دوسری بندرگاہیں، خاص کر بندرعباس وغیرہ دبئی، بحرین،کویت اور عدن سے بھی زیادہ ہمارے نزدیک ہیں۔ ایران تیل کا بڑا برآمدکنندہ اور پاکستان کا دوست ملک ہے۔ ہمارے ملکوں کے جہاز نہ صرف ایک دوسرے کی بندرگاہوں میں آتے جاتے رہتے ہیں بلکہ ہمارے بہت سے جہاز ران ایران کے جہازوں کو، شہنشاہِ ایران کے زمانے سے چلاتے رہے ہیں۔ ایران اور عراق والی لڑائی میں ایران کے اتنے نوجوان شہید ہوئے تھے کہ ہمارے بہت سارے جہاز ران، ان کے پاس کام کرنے لگے۔ لیکن عجیب اتفاق ہے کہ نوکری کے دوران، میں جس بحری جہاز پر بھی رہا اسے ایران کا سفر درپیش نہیں ہوا۔ سمندری

ملازمت کے دوران گو مجھے دنیا کی دور دراز بندرگاہوں پر جانے کا موقع ملتا رہا، لیکن میں اس پڑوسی ملک کے کسی بھی شہر یا بندرگاہ کو دیکھنے سے محروم رہا۔ البتہ ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد میں ایران میں ایک مسافر کی طرح اپنے کرائے اور خرچ پر گھوما پھرا۔

پہلی دفعہ میں ایران زیارت کرنے والوں کے ساتھ گیا۔ اپنے دوست کیپٹن مظہر زیدی، جن کے ساتھ مجھے کتنے ہی جہاز چلانے کا موقع ملا، کے کہنے پر کراچی کے ایک ٹریول ایجنٹ "الحرمین" کے پاس گیا جنہوں نے مجھے ایک ایسے قافلے کے ساتھ شامل کیا جو یہاں سے ہوائی راستے سے ایران روانہ ہو رہا تھا۔ ان کا ایک آدمی بھی ساتھ جا رہا تھا۔ شروع میں کیپٹن مظہر زیدی نے بھی میرے ساتھ جانے کا پروگرام بنایا تھا اور مجھے صبح و شام آکر اسلام پر لیکچر دیتے رہے لیکن پھر عین وقت پر کسی ضروری وعدہ کی وجہ سے انہوں نے اپنے جانے کا ارادہ منسوخ کردیا۔ جس کا انہیں خود بھی بہت افسوس ہوا۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا "اچھا ہوا کہ تم نہیں چل رہے ہو۔"

"کیوں بھلا؟" کیپٹن مظہر زیدی نے حیرت سے پوچھا۔

"اس لئے کہ تمہاری باتوں سے لگتا ہے کہ تم مجھے صرف مسجدوں اور مزاروں میں قید کر رکھو گے۔" میں نے کہا۔ "میں ایران کی دوسری چیزیں بھی دیکھنا چاہتا ہوں تاکہ سفرنامہ لکھ سکوں۔"

زیارتوں پر لے جانے کے لئے بندوبست کرنے والے کراچی کے ٹریول ایجنٹ "الحرمین" نے ہمارے گروپ کے لوگوں کو نمازِ جمعہ کے بعد محمد علی جناح روڈ پر اپنے آفس کے سامنے والی امام بارگاہ علی رضا میں سفر کے بارے میں بتانے کے لئے بلایا۔ میں نے کیپٹن مظہر زیدی کو فون کرکے پوچھا کہ "میرا جانا بھی ضروری ہے کیا؟" میرا مطلب تھا کہ تمام عمر سفر میں گزری ہے، اب کیا میں جاکر وہی لیکچر—— وہی باتیں پھر سے سنوں"!

"میرے خیال میں ضرور جاؤ۔" انہوں نے کہا "کم از کم اپنے گروپ کے لوگوں کو تو دیکھ سکو گے جو اس قافلے میں تمہارے ساتھ ہوں گے۔"

وہاں پہنچ کر میں نے محسوس کیا کہ اچھا ہوا کہ میں اس بریفنگ کے لئے آگیا اس لئے کہ اپنے قافلے کے ساتھ جانے والے لوگوں سے شناسائی کے علاوہ محمد علی صاحب کی باتیں سننے کا بھی موقع ملا جن میں کتنی ہی معلوماتی اور دلچسپ تھیں بالخصوص ان مسافروں کے لئے جو پہلی دفعہ ملک سے باہر جارہے ہوں۔ یہاں آکر مجھے پتہ چلا کہ ہر ایک کو اپنے ساتھ پلیٹ، چمچہ اور چائے پینے کے لئے مگ بھی لے کر چلنا ہے۔ کیونکہ کھانے پینے کی فراہمی کی ساری ذمہ داری "الحرمین" نے اٹھائی ہے، یعنی ہمارے اس پیکیج میں شامل ہے۔ مشہد یا قم پہنچ کر پتہ چلتا کہ ہمارے ٹور کا لیڈر کسی ہوٹل سے بریانی یا سالن کا دیگچہ اٹھا کر لایا ہے اور سبھی اپنی پلیٹیں سنبھالے بیٹھے ہیں، سوائے

میرے!

ایسی ہی واردات میرے ساتھ ایک دفعہ ملائیشیا میں بھی ہو چکی ہے، جب ہم ٹوئر کمپنی کے ذریعے ملائیشیا کے جنگل میں ٹریکنگ پر گئے تھے۔ یہ کمپنی پینانگ سے چکن نوڈل کا دیگچہ لے کر چلی تھی۔ سبھی پلیٹیں ساتھ لے کر گئے تھے لیکن مجھے اس کا پتہ نہیں تھا۔ مشہد، تہران یاقُم تو پھر بھی بڑے شہر ہیں اور دن رات کھلے ہوئے ہیں۔ ہر شے دُکان سے لی جاسکتی ہے۔ ملائشیا کے جنگل میں پلیٹ کہاں سے آئے! بہتر ہوا کہ وہاں کیلے کی فصل تھی جس کے پتّے پر نوڈل، اچار اور سلاد رکھ کر میں نے کھانا کھایا۔ ویسے بھی ملائےشیا اور سنگاپور میں ساؤتھ انڈین ہوٹل میں تامل لوگ پلیٹ کے بجائے کیلے کے پتے پر کھانا رکھ کر کھاتے ہیں۔۱

اس بریفنگ میں ہمارے ٹریول ایجنٹ اور ٹوئر کرانے والے لیڈر محمد علی صاحب نے پہلے تو یہ بتایا کہ وہ ہمیں تہران، مشہد اور قم جیسے بڑے شہروں کے علاوہ نیشاپور (جہاں عمر خیام کا مقبرہ ہے اور جس شہر سے مشہور شاعر اور صوفی Mystic فریدالدین ۲ عطار اور مشہور مصور کمال الملک کا تعلق ہے) اور کاشان شہر (جو قم اور کرمان روڈ پر ہے، اور تاریخی مقامات کے حوالے سے مشہور ہے) بھی لے جائیں گے۔ ”سب سے زیادہ اہم شے مشہد اور امام رضا ؑ کا روضہ ہے۔“ انہوں نے بتایا ”جس کی زیارت سب سے اہم ہے۔ جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ حج سے زیادہ ثواب ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کوئی حج نہ کرے، مشہد سے ہو کر آ جائے اور کہے کہ میں نے سات سو حجوں کا ثواب پالیا۔ حج، نماز، روزہ وغیرہ پہلے ہیں۔"

محمد علی صاحب نے کہا کہ امام رضا ؑ کے روضے کی زیارت کا ثواب اس طرح ہے جیسے ”اوور ٹائم“ جو نارمل ڈیوٹی والے کام سے ہمیشہ زیادہ ہوتا ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ پہلے نارمل ڈیوٹی یعنی حج، نماز، روزہ وغیرہ مکمل کرے۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی صبح کی ڈیوٹی پر نہ آئے، شام کے پانچ بجے چھٹی کے وقت آ کر کہے کہ میں اوور ٹائم کرلوں تو اسے اوور ٹائم ہرگز نہ مل سکے گا۔

ہمارے ایران کے اس ٹوئر کے گائیڈ محمد علی صاحب کے اس لیکچر کی کچھ باتیں مختصراً یہ ہیں:

۱۔ ایران کی ان زیارتوں پر جانے سے پہلے ناراض اَعِزّا (رشتہ داروں) دوستوں کو مناکر (خوش کرکے) جاؤ تو بہتر ہے۔

۲۔ سفر میں کسی کو تکلیف دینے کے بجائے دوسرے کی تکلیف share کرکے ثواب پانے کی کوشش کرو۔

۳۔ عورتوں کو چاہئے کہ برقعہ یا بڑی چادر اوڑھ کر امام رضا ؑ کے روضے پر اور دوسری عبادت گاہوں میں جائیں۔

۴۔ سامان، اپنے ساتھ جہاں تک ہو سکے کم لے کر چلو کیونکہ یہ سفر کے دوران خود تمہیں ہی اٹھانا ہے۔ اپنی

آنکھوں کے سامنے سامان کو بند کرکے تالا لگاؤ۔ دوسروں کا لے جانے سے پرہیز کرو۔ یا کم از کم اسے کھول کر اچھی طرح تسلی کرلو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی نشہ آور شے دے کر تمہیں پھنسا دے۔ ایران میں پابندی والی اشیاءلانے کی سزا موت ہے۔ ایئرپورٹ پر کوئی تمہیں تھوڑی دیر کے لئے بھی کوئی شے پکڑنے کو کہے تو ہرگز نہ لو اور نہ ہی کسی کی رکھی ہوئی شے کو ہاتھ لگاؤ۔

۵۔ اپنے ساتھ صحیح قسم کا مضبوط بیگ لے کر جاؤ۔ کتنے ہی لوگ سفر میں پرانا اور کمزور بیگ لے کر چل دیتے ہیں اور پھر اس کے ٹوٹنے پر اپنے واسطے پریشانی پیدا کرلیتے ہیں۔ آج کل بہترین بیگ وہی ہے جس میں فیتے (اسٹریپ) لگے ہوں تاکہ اسے کھینچنے میں آسانی رہے۔

محمد علی صاحب نے بتایا کہ ایران میں کتنے ہی پاکستانی رہتے ہیں جو خیر خبر کرنے پر سامان ساتھ کردیتے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ ان کو ایک شخص نے دس کلو سامان لے جانے کے لئے بہت منتیں کیں اور وہ ہاں کر بیٹھے۔ آخری دن جب وہ شخص بیگ لے کر آیا تو اس کا وزن بیس کلو سے بھی زیادہ تھا اور بیگ بھی ایسا تھا جس میں فیتے نہ ہینڈل! بیگ نہ تھا گویا تربوز یا خربوزہ! تالے کے بجائے رسی سے بندھا ہوا تھا جسے کھول کر کسٹم والوں کو چیک کرایا جائے سو بہتر ہے کہ ایسے وعدے سے بچ کر رہا جائے۔

٦۔ ہماری ہر وقت یہی کوشش ہوتی ہے کہ آپ کے لئے ہر جگہ عمدہ بندوبست کیا جائے لیکن جہاں لاکھوں لوگوں کی آمدورفت رہتی ہو وہاں کبھی کبھی ہوٹلوں اور بسوں میں بہترین سروس نہ ملنے کی شکایت رہتی ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہماری طرف سے ادائگی (Payment) ایئرکنڈیشن بس کی ہوئی ہوتی ہے لیکن کسی سبب سے وہ نہیں پہنچ سکتی ہے۔ اب اس کے انتظار میں نامعلوم وقت تک انتظار کرکے وقت برباد کرنے کے بجائے عام بس میں ہی لے کر جانا پڑتا ہے۔ ایک دوسری مثال ہوٹلوں میں ہم نے کمرے بُک کرائے لیکن ہمیں تہران سے مربوط فلائیٹ ملنے میں دیر لگی اور مشہد یا کسی دوسرے شہر وقت پر نہ پہنچ سکے اور اسی دوران ہوٹل والوں کے پاس کسی عربی ملک کا امیر پہنچ گیا اور اس نے ہمارے کچھ کمرے اسے دے دیئے اور ہمیں اتنے کمرے کسی دوسرے ہوٹل میں ڈھونڈنے پڑے جو پہلے والے ہوٹل سے اعلیٰ بھی ہو سکتے ہیں اور ادنیٰ بھی۔

۷۔ کوشش کرکے سفر سے لطف اندوز ہوں۔ بعض ایسے مسافر بھی ہوتے ہیں جو معمولی معمولی باتوں پر خود بھی پریشان ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی پریشان کرتے ہیں۔ بعض باتیں ایسی ہیں جو اس ملک کے سسٹم میں شامل ہیں ہم ان سے بچ نہیں سکتے۔ کسی یورپ، انگلینڈ اور فرانس کی ریلوں میں سوار ہونے کے بعد پاکستان میں زکریا ایکسپریس کی پھٹی ہوئی سیٹوں، جھکولے کھانے اور وقت پہ اسٹیشن نہ پہنچنے کی شکایت کرنے پر کیا ہمارا ریلوے کا محکمہ اسی وقت اپنی گاڑیوں کو یورپ کے معیار پر لا سکتا ہے؟ سو بلاوجہ جلنے کڑھنے سے اپنی طبیعت خراب نہ

کیجئے۔"میں نے ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں جو اگرچہ ناز و نعم میں رہتے سہتے ہیں لیکن پھر بھی سفر میں پیش آنے والی تکلیف سے درگزر کرتے ہیں اور ہر شے سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔" محمد علی صاحب نے بتایا۔

۸۔ مشہد اور قُم جیسے شہروں میں جس کام یعنی زیارت اور عبادت کے لئے جارہے ہیں، اسی کو وقت دینے کی کوشش کریں۔ شاپنگ کے لئے وقت برباد کرنا بیکار کام ہے۔ یہ میڈ اِن چائنا اشیاء آج کل ہر جگہ یکساں ہیں بلکہ پاکستان میں آپ کو زیادہ سستی ملیں گی۔ راہ چلتے ہوئے اگر کوئی شے آپ کو نظر آجاتی ہے تو اسے خریدنا بہتر ہے کہ وقت برباد نہیں ہوگا۔ لیکن کسی شے کی خریداری کے لئے اس کی تلاش میں تمام دن گنوا دینا بیوقوفی ہے۔

۹۔ اپنے ملک سے باہر آپ کی حیثیت اپنی ذاتی نہیں ہے بلکہ آپ اپنے ملک کے سفیر ہیں۔ آپ کا ہر اچھا یا برا عمل آپ کے اپنے ملک کی طرف منعکس (Reflect) ہوتا ہے۔ خریداری کے وقت آپ شے کی قیمت کا اندازہ لگا کر اس کے مطابق دُکاندار کو قیمت کم کرنے کے لئے کہیں۔ ہمارے ملک کے بعض لوگ قیمت کم کرنے کی خاطر دُکاندار سے ایسی منت سماجت کرتے ہیں کہ دُکاندار یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ یہ کیسے مسکین اور فقیر آنکلے ہیں اور وہ ایسے گاہک سے اپنی جان چھڑانے کی خاطر شے کی اصل قیمت سے بھی ہاتھ اٹھا لیتا ہے اور مفت میں ہی دے ڈالتا ہے تاکہ وہ چلا جائے۔

۱۰۔گھر سے باہر، خصوصاً پردیس میں وہ کھانا ملنا آسان نہیں جس کے آپ عادی ہیں۔ لیکن آپ کو اتنا بتادوں کہ ایران ان ملکوں میں سے ہے جن میں صحت مند اور صاف ستھرا کھانا پکتا ہے، پکایا جاتا ہے اور ہر جگہ صفائی کا خیال رکھا جاتا ہے۔ہمارے قافلے میں کچھ ایسے مسافر بھی تھے جو پہلے بھی ایران سے ہوکر آئے تھے اور ہمارے گائیڈ محمد علی سے ان کی جان پہچان تھی تب ہی تو محمد علی نے ان میں سے ایک خاتون کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ آنٹی سے پوچھئے۔ ان کے گھر کے پیچھے لاہور کی فلاں مٹھائی شاپ کا پچھلا حصہ ہے۔ سامنے سے دُکان میں داخل ہوں تو صاف ستھری اور ایئرکنڈیشنڈ لیکن عقب میں، جدھر اس کا کچن ہے کیا گندگی ہے۔ کوڑا کرکٹ، مکھیوں کا انبار، کتے بلیاں اور گندے باورچی۔ آپ اگر دیکھ لیں تو اس دُکان سے مٹھائی خریدنا چھوڑ دیں۔ یہی حال ہمارے ملک میں دیگر ہوٹلوں اور ریستورانوں کا ہے۔ لیکن ایران میں یہ بات نہیں۔ وہاں ظاہری میک اپ اور شو شاک بجائے اصل بات صفائی اور عمدہ شے کی ہے۔ چھوٹے چھوٹے ہوٹلوں کے باورچی خانے اور باورچی آپ کو صاف ستھرے ملیں گے۔ آپ کو کہیں بھی باسی کھانا یا بکری کے نام پر بوڑھی اور بیمار گائے یا بیل کا گوشت نہ ملے گا۔ ایران کی حکومت کا محکمہ ٔ صحت اور فوڈ ڈیپارٹمنٹ اس معاملے میں بے حد سخت ہے اور وہاں قانون پر عمل کرایا جاتا ہے۔ اس لئے آپ کو ایران میں کھانے کے معاملے میں فکرمند نہیں ہونا چاہئے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ایرانی ڈشوں میں ہماری طرح سرخ مرچوں اور گرم مسالوں کا اس قدر استعمال نہیں ہوتا۔ بہرحال آپ ایک کام

کرسکتے ہیں کہ یہاں سے ان مرچ مسالوں کو بھون کر اپنے ساتھ لے جائےں پھر وہاں کے پھیکے سالن میں تھوڑا تھوڑا ڈال کرکھاسکتے ہیں یا یہاں ڈبوں میں پیک سالن ملتے ہیں وہ آپ اپنے ساتھ لے جاسکتے ہیں۔

۱۱۔ ایران کی نہ فقط ہوٹلیںاور دُکانیں صاف ستھری ہیں بلکہ راستے اور گلیاں بھی گندگی اور کچرے سے خالی ہیں۔ اس قدر عوام کا پھینکا ہوا گند کچرا کیوں کر صاف کیا جاتا ہے سمجھ میں نہیں آتا۔ ایران کے بعد آگے عراق اور شام میں آپ کوکتنے ہی مقامات پر اپنے ملک جیسی گندگی نظر آئے گی اور اپنائےت کا احساس ہوگا لیکن میری آپ کو یہی صلاح ہے کہ آپ اچھے ٹوئرسٹ ہونے کی مثال قائم کریں۔ اِدھر ادھر گند کچرا پھینکنے سے گریز کریں۔ چاہے ایران ہو یا عراق اور شام۔

۱۲۔ ایران نے اتنی ترقی کرلی ہے کہ وہاں کی دیہاتی عورتیں بھی ہماری عورتوں کو ماڈرن لگیں گی۔ جبکہ وہ ایرانی عورتیں جو واقعی ماڈرن ہیں اور جو شوہروں کے ساتھ یا اکیلی ہی فرانس جرمنی کے چکر لگاتی ہیں وہ تو نجانے کیا ہیں! بہرحال وہ اچھی طرح سے پردہ کریں نہ کریں لیکن سب یہی چاہتے ہیں اور ہماری خواتین کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے جسم کو اچھی طرح ڈھانپ کر چلیں پھریں کیونکہ ہمارا امیج ’زائرین‘ کا ہے جسے برقرار رکھنا چاہئے۔

۱۳۔ مشہد شہر میں جہاں امام رضاؑ کا روضہ ہے وہاں ایک تو ہم نے رہائش کا بندوبست نزدیک رکھا ہے اور امام رضاؑ کے روضے پر آپ کسی بھی وقت جاسکتے ہیں۔ رات بھر لوگ آتے جاتے رہتے ہیں اور ایران میں ایسی کوئی بھی بدامنی نہیں ہے کہ راہ چلتے کوئی شخص عورتوں کو تنگ کرے۔ ایران ان باتوں سے پاک ہے لیکن اس کے باوجود عورتوں سے مردوں تک کے لئے بہتر ہے کہ وہ شہر کی تنگ اور ویران گلیوں سے گزرنے کے بجائے عام گزرگاہوں اور آمدورفت کے چلتے راستوں سے گزریں نیز یہ کہ عورتیں ملبوسات و زیورات کی نمائش نہ کریں کیونکہ ہوسکتا ہے کہ کوئی ہمارے ملک کا ہی جیب کترا یا اٹھائی گیرا لوگوں کی بہتات اور دھکم پیل سے فائدہ اٹھاکر آپ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرے۔

۱۴۔ عام استعمال کی دوائےں جیسے درد، دست، سردی زکام کی گولیاں اور خاص خاص دوائےں جیسے بلڈپریشر، ڈائبیٹیز، تھائرائےڈ وغیرہ کی دوائےں اپنے ساتھ یہیں سے لے کر جائےں۔

۱۵۔ پلنگ بستر کا ہر جگہ بندوبست ہوگا لیکن اس کے باوجود ایک چادر اپنے ساتھ لے جائےں تاکہ اس کے اوپر ہوٹل کا کمبل اوڑھ سکےں۔

اس گروپ میں جو افراد میرے ساتھ جا رہے تھے، ان سبھی کا تعلق اہلِ تَشیُّع ± سے تھا بلکہ ”کاروان الحرمین“ کی طرف سے اس سفر کا بندوبست بھی کچھ اس طرح کیا جاتا ہے کہ وہ ہمیں زیادہ سے زیادہ مذہبی مقامات

دکھاسکیں۔ ان کی طرف سے دیئے گئے پروگرام کے بروشر پر لکھا ہے کہ یہ سفر ایک مقدس سفر ہے۔ اپنے آپ کو قلبی طور پر اس سفر کے لئے آمادہ کریں۔

۱۶۔ اس سفر کو ربِّ پاک کا فضل و کرم سمجھ کر خود کو تیار رکھیں۔

۱۷۔ اگر کہیں کسی شخص کا آپ پر قرض ہے تو وہ اسے ادا کردیں۔ لوگوں سے کہہ سُن کر بخشش کرائےں۔

۱۸۔ اگر ہو سکے تو اس سفر پر روانہ ہونے سے پہلے تین دن روزہ رکھےں۔

۱۹۔ سفر کے دوران کسی بھی صورت میں واجبات کو ترک نہ کریں۔

۲۰۔ نماز، وقت کی پابندی سے مسجد میں ادا کرنے کی کوشش کریں۔

۲۱۔ گِلہ، غیبت، جھوٹ، بدگمانی، غصہ، اول فول بکنا جَھکنا، یا ایسے ہی دوسرے حرام کاموں سے پرہیز کریں۔

۲۲۔ سفر کی تکلیف سے پریشان ہوکر غصہ نہ کیجئے۔

۲۳۔ خواتین پردے کا خاص طور پر خیال رکھیں۔

میرے دوست کیپٹن مظہر زیدی نے ہمارے گائےڈ محمد علی صاحب کو میرے لئے بتا دیا تھا کہ میں کچھ دن قُم اور مشہد شہروں کی قدیم لائبریریوں میں وقت گزارنے کے علاوہ تبریز، شیراز، کرمان اور اصفہان بھی جانا چاہتا ہوں اور دو ایک دن کے لئے ایران کے بندرگاہ والے شہر چھابہار کی نیول اکیڈمی میں دو ایک لیکچر بھی دینا چاہتا ہوں۔ الحرمین والے جو نہ صرف مقدس مقامات (حج، عمرہ، زیارت) کے لئے ہی لے جاتے ہےں بلکہ مختلف ہوائی کمپنیوں کے نمائندے، ٹریول ایجنٹ بھی ہیں، انہوں نے میرا ٹکٹ آزاد (کھلا ہوا) ہی رکھا۔ ”ایران کا ہوائی جہاز ہر چوتھے دن کراچی جاتا ہے۔“ انہوں نے بتایا۔ جس ہفتے تم واپس جانا چاہو اس کے چوتھے دن (یعنی بدھ کے دن) تہران کے ایئرپورٹ پر پہنچ جانا۔"

دراصل پہلے میرا یہ خیال تھا کہ ایران صرف وہی لوگ جاتے ہیں جو کہ شیعہ ہیں لیکن ہمارے گوٹھ ہالا سے ایران جانے والے ایک واقف کار نے بتایا کہ ایران ایک لبرل ملک ہے جہاں لوگ آزادی کے ساتھ مذہبی، تاریخی، قدیم اور جدید مقامات دیکھنے اور شاپنگ کے لئے آتے رہتے ہیں اور جب اپنے ایران جانے کے پروگرام کے بارے میں اپنے ایک عرب دوست کمانڈر عبدالجبار الشہری سے بات کی تو پتہ چلا کہ وہ بھی کئی دفعہ چھٹیاں گزارنے تہران، مشہد اور اصفہان جاچکا ہے۔ ہم نے چھابہار کی نیول اکیڈمی میں ملنے کا پروگرام بنایا۔ جہاں کے کچھ پروفیسر صاحبان

ہمارے گروپ میں تھے جب ہم نے ورلڈ میری ٹائم یونیورسٹی، مالمو، سویڈن سے پوسٹ گریجویشن ایک ساتھ کی تھی۔

جانے سے پہلے ایران کی بابت رائے

ایران جانا بھی میرے لئے ایک بڑا تجربہ تھا۔ جانے سے قبل میں عجب واہموں اور وسوسوں میں تھا۔ ظاہر ہے جس مغرب کی دنیا (یورپ اور امریکا) سے میرا واسطہ رہا وہاں یہ ہو نہیں سکتا کہ کسی کے کان ایران کی تعریف سن سکیں۔ مجھے تو یوں لگتا تھا کہ مجھے ایئرپورٹ سے ہی واپس لوٹا دیں گے کہ تو سُنّی ہونے کے باوجود ایران آیا ہے! کبھی سوچتا تھا کہ میں ایران پر سفرنامہ لکھنے کے لئے جارہا ہوں جس کے لئے فوٹو بھی کھینچنا چاہوں گا لیکن ایران جیسا ملک جس کے بارے میں میرے دماغ میں یہی تھا، بلکہ زیادہ پختہ یقین ہو چکا تھا کہ وہ ایک کٹر قسم کا مسلمان ملک ہے۔ جہاں کی خواتین سخت پردے میں ہوتی ہیں۔ جہاں گلی گلی میں مولوی حضرات وعظ کرتے ہیں۔ وہاں بھلا فوٹو کھینچنے کی اجازت کہاں ہوگی۔ مجھے خیالوں ہی خیالوں میں یوں لگتا تھا کہ ایران میں کسی عورت مرد کی تو کیا، کسی عمارت کی تصویر کھینچنے پر بھی ایرانی مولوی مجھے واپس لوٹا دیں گے کہ تصویر کیوں کھینچتے ہو؟ کہیں تم امریکی ایجنٹ تو نہیں۔ کہیں ہمارے ملک کے راز فاش تو نہیں کر دو گے؟ جیسے ہمارے ہاں بندرگاہ میں کیمرہ لے کر چلے جاؤ تو لوٹا دیں گے کہ تصویر مت کھینچو یہ Secret عمارات ہیں۔ اگرچہ جناح برج سے گزرو تو ساری بندرگاہ نظر آ جاتی ہے اور جو چاہے ساری بندرگاہ کی مووی بھر کر لے جائے۔

میں نے یہ بھی سوچا کہ میرا پاسپورٹ دیکھ کر جس پر امریکا اور یورپ کے کتنے ہی ممالک جو ایران کو صبح شام گالیاں دیتے ہیں، ویزے لگے ہوئے ہیں۔ مجھے تو تہران سے ہی واپس نہ کردیں۔ آخر کیوں نہ کریں! جب امریکا جیسا اس قدر طاقتور ملک (جسے ایران جیسے ملک کی تو پرواہ ہی نہ ہونی چاہئے) وہ جب کسی مسافر کے بارے میں سنتا ہے کہ وہ ایران میں بھی رہ چکا ہے تو اس سے اپنی دھرتی پر پہنچنے پر دسیوں سوال کیے جاتے ہیں۔ لیکن تعجب کی بات تو یہ ہے کہ ایران پہنچنے اور ایران میں قیام کے دوران مجھے اتنی سی تکلیف بھی پیش نہ آئی جتنی کسی دوسرے مسلمان عرب ملک میں ہوتی ہے۔ پاکستان جانے یا وہاں سے واپس آنے کے وقت بھی کافی پریشانی ہوتی ہے مگر یہاں ایران میں اتنی بھی نہ ہوئی، بس جیسے کراچی سے لاڑکانے پہنچا ہوں۔ جہاں جدھر دل چاہے رکشہ، تانگے یا ٹرین میں چکر لگا لوں۔ کبھی کسی نے پاسپورٹ کا بھی نہ پوچھا۔ ایئرپورٹ سے نکلنا بھی منٹ بھر میں ہوگیا۔ امیگریشن کی مُہر لگانے والے سے لے کر اندراج (Entry) کرنے والے تک کسی کا کمپیوٹر خراب نہ تھا۔ جو مصیبت اکثر عرب ملکوں میں ہوا کرتی ہے اور مسافر بگلے کی مانند ایک ٹانگ پر کھڑے انتظار کرتے رہتے ہیں کہ کوئی فلپائنی یا مصری آئے اور کمپیوٹر کو ٹھیک کرے۔ کیونکہ عربوں کو تو یہ کام آتے ہی نہیں نا! لیکن ایرانی اس معاملے میں تیز

ہیں بلکہ بعض کاموں میں تو وہ یورپیوں سے بھی تیز ہیں۔ اس بات کی گواہی خود میں بھی دے سکتا ہوں۔

جب سوےڈن کی یونیورسٹی میں ہم پوسٹ گریجویشن کر رہے تھے تو یہ پرسنل کمپیوٹر نیا نیا آیا تھا۔ تھیسز لکھنے کے لئے ان دنوں کا اوئلی پروگرام استعمال کیا جاتا تھا۔ ”ورڈ پرفیکٹ“ ان دنوں میں ابھی نکلا ہی تھا وہ بھی صرف امریکا میں تھا اور یورپ کی طرف ابھی نہیں پہنچا تھا۔ نہ کسی میں ہمت تھی کہ وہاں سے CD منگائے جس کی قیمت ان دنوں تیس ہزار روپے کے لگ بھگ تھی۔ یونیورسٹی کے چھ ایرانی اسٹوڈنٹ میرے پاس آئے کہ ان میں سے ایک کو یہ پروگرام آتا ہے اور وہ چندہ کرکے یہ CD امریکا سے منگا رہے ہیں۔ جس میں وہ مجھے بھی شامل کرنا چاہتے ہیں۔ مجھے خوش نصیب کہا جائے کہ میں نے ان سے سیکھ لیا اور ہم نے اپنی تھیسز بہتر نمونے پر ٹائپ کرلی۔ اس بات نے ہمارے یورپی ساتھیوں کو بھی حیرت میں ڈال دیا۔ بہرحال آج کے دور میں تو جانے کیسے کیسے پروگرام نکل آئے ہیں اور ہمارے جیسے ملکوں میں جہاں کاپی رائٹ کی سختی نہیں ہے، چالیس روپے سے بھی کم قیمت پر CD مل جاتی ہے اور کمپیوٹر ٹیکنالوجی گوٹھ گوٹھ میں عام ہو چکی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہم اور عرب ملک ابھی تک سست رفتاری سے آگے بڑھ رہے ہیں لیکن انڈیا اور ایران نے تو حیرت انگیز ترقی کر ڈالی ہے۔ نہ صرف کمپیوٹر میں بلکہ ہر فیلڈ میں۔ تب ہی تو ایران جیسا چھوٹا سا ملک اپنے سے زیادہ طاقتور ملکوں سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکتا ہے۔

ہوائی جہاز میں چڑھنے کے وقت مجھے بڑی حیرت ہوئی جب ہوائی جہاز کے دروازے پر ہم مسافروں کو ایرانی ایئرہوسٹس نے خوش آمدید کہا۔ میں تو سمجھتا تھا کہ ایران کے جہاز پر مسافروں کا خیال رکھنے یا Serve کرنے کے لئے مرد اسٹیورڈ ہی ہوں گے۔ مگر یہاں تو عام فلائٹس کی طرح ایئرہوسٹس لڑکیاں ہی تھیں۔ ایسا بھی نہیں کہ کوئی بوڑھی یا کریہہ المنظر ہوں، چھوٹی عمر کم سن اور نہایت خوبصورت تھیں۔ ایران کے لوگ رنگ و روپ میں یورپین کی طرح سفید (گورے) تو ہیں ہی۔ ساتھ میں بیٹھا رحمت علی بھی شاید یہی بات سوچ رہا تھا۔ چنانچہ جیسے ہی ایئرہوسٹیس سوئیٹس (Sweets) دے کر چلی گئی تو اس نے کہا کہ ”جس ملک میں عورتوں کو ایئرہوسٹس بننے کی اجازت ہے اس کے لئے یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ وہاں کی عورتوں کو گھر میں قید کرکے رکھا ہوا ہے۔"

رحمت علی بھی میرے گروپ کے ساتھ ایران جا رہا تھا۔ وہ اس گروپ کو قافلہ کہتے ہیں۔ کیونکہ تیس افراد کے قافلے کا ایران جانا فقط اس مقصد سے ہے کہ وہاں کے پاک مقامات کی زیارت کی جائے۔ رحمت علی گزشتہ ۱۴ سال سے کینیڈا میں رہتا ہے۔ اس کے دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے اور اب وہ بال بچوں اور بیوی سمیت ایران جا رہا تھا۔ وہ بھی میری طرح گھبرایا ہوا تھا کیونکہ اس کے ذہن میں بھی ایران کے بارے میں صرف منفی باتیں بیٹھی ہوئی تھیں اور ہر وہ بات اسے

بھی میری طرح حیرت زدہ کردیتی تھی جو ذہن میں پہلے سے بیٹھی ہوئی باتوں کی الٹ نظر آتی تھی۔ اس نے ایران کی عورتوں کے بارے میں یہی سوچ رکھا ہوگا کہ وہ بھی افغان عورتوں کی طرح برقعہ پہن کر چلتی پھرتی ہوں گی بلکہ تمام دن گویا گھر کے اندر بیٹھی رہتی ہوں گی۔ کسی ضروری کام کے لئے گھر کی بڑی بوڑھی برقعہ پہنے باہر نکلتی ہوگی اور اس کا کسی مرد سے بات کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن ہوائی جہاز میں ایئرہوسٹس اور تہران کے ایئرپورٹ پر امیگریشن اور کسٹمز میں آدھے سے زیادہ عملہ نوجوان عورتوں پر مشتمل دیکھ کر ہمیں اور بھی زیادہ حیرت ہوئی۔ وہ اچھی انگریزی میں اور بہت پُھرتی سے ہر کام سرانجام دے رہی تھیں اور ایک جگہ سے دوسری جگہ آنے جانے (چلنے پھرنے) میں بھی اسمارٹ لگ رہی تھیں۔ میرا مطلب ہے کہ ہمارے ایئرپورٹ پر کام کرنے والی لڑکیوں کی طرح سست (lazy) نہیں تھیں۔ جن سے بات کرو یا معلومات کی خاطر کچھ پوچھو تو جیسے کوئی بیبیاں ہوں جن کا کام صرف دھاگا بٹ کر دینا ہے۔

بہرحال آج میں خوش تھا کیونکہ میں ایک ایسے ملک کو جارہا تھا جو کہ ہمارا ہمسایہ ملک ہے۔ جو خوبصورت ہے۔ جس میں کتنے ہی ولی، اولیاء، حاکم، شہنشاہ، ادیب اور شاعر ہوئے اور جو ملک امریکا جیسے طاقتور ملک کو پاگل کیے ہوئے ہے۔

ہمارا سفر ایران کی قومی ہوائی کمپنی ایئر ایران کے ہوائی جہاز کے ذریعے ہوا تھا۔ جس کا جہاز ہر اربعاء (چوتھے دن تہران سے کراچی پہنچتا ہے، ایک بجے اور ڈھائی بجے کے قریب کراچی سے مسافر لے کر تین گھنٹوں کے سفر کے بعد چار بجے کے قریب تہران پہنچتا ہے۔ ایران اور پاکستان کے وقت میں ڈیڑھ گھنٹے کا فرق ہے اور تہران جیسا کہ کراچی سے بہت بلندی پر (طول البلد، (latitude پر واقع ہے، (اسلام آباد سے بھی بہت اوپر شمال میں ہے) اسی وجہ سے آج کل سردی کے موسم میں کراچی سے پون گھنٹہ قبل سورج غروب ہوتا ہے یعنی آج کل کراچی میں پونے چھ بجے سورج غروب ہوتا ہے تو تہران میں مقامی وقت کے مطابق پانچ بجے سورج غروب ہوتا ہے۔ سو اُس روز ہمارا جہاز جیسے ہی تہران کے ایئرپورٹ پر اترا تو سورج غروب ہونے والا تھا۔ پھر جب ہم امیگریشن اور کسٹم سے کلیئر ہوکر باہر نکلے تو سورج غروب ہو چکا تھا اور کراچی کے مقابلے میں کہیں زیادہ ٹھنڈک محسوس ہو رہی تھی۔ کراچی سے نکلتے وقت ہاتھ پر ڈالا ہوا جو سویٹر اور گرم کوٹ کھائے جارہا تھا اور یہی سوچ رہے تھے کہ یہ بیکار کا بوجھ اٹھا کر چلے، وہ اب اچھا لگنے لگا اور سویٹر پہن کر میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ اچھی عقل آئی کہ یہ لے کر چلے تھے ورنہ ایسی سردی میں گھومنے کا مزہ جاتا رہتا اور مشہد جو ایران میں ہماری پہلی منزل تھی وہ تو ابھی اور بھی شمال میں ہے۔

یاد رہے کہ کراچی ۲۵ درجے latitude پر ہے، لاہور ساڑھے اکتیس پر، پشاور ۳۴ پر، تہران اس سے بھی اوپر شمال

میں ۳۵ ڈگری پر ہے او رمشہد ۳٦ پر۔ جیسے جیسے اور اوپر شمال قطب شمالی کی طرف جائےں تو latitude بڑھتا جائے گا اور اس کے ساتھ ٹھنڈک بھی۔ پھر اس کے ساتھ دن کا دورانیہ (Duration) گھٹتا جائے گا، اگر سردی والے مہینے ہیں تو اور گرمی والے مہینے ہیں تو جیسے جیسے شمال کی طرف جاؤ تو رات چھوٹی اور دن بڑا ہوتا جائے گا۔ دسمبر کے مہینے میں، سوےڈن کے شہر اسٹاک ہوم میں (جو ساٹھ ڈگری سے بھی اوپر ہے) دن مشکل سے پانچ گھنٹوں کا ہوتا ہے اور رات ۱۹ گھنٹوں کی۔ سنگاپور اور کوالالمپور جیسے شہروں میں جو خطِ استوا (یعنی زیرو ڈگری latitude) کے نزدیک ہیں بارہ مہینے چاہے دسمبر ہو یا جون جولائی، دن رات ایک برابر، بارہ گھنٹوں کے لگ بھگ ہوتے ہیں۔

کراچی سے تہران جانے کے لئے میں نے معلوم کرایا کہ اگر اپنے ملک کی P.I.A کی کوئی پرواز تہران جاتی ہو تو پھر اس میں سفر کیا جائے۔ یہ تو کہا نہیں جاسکتا کہ ہمارے جہاز ایران نہ جاتے ہوں۔ مجھے یاد ہے کہ ملائےشیا کے شہر ملاکا (جہاں کی میرین اکیڈمی میں مجھے قریباً آٹھ سال نوکری کرنے کا موقع ملا) میں ایک ٹریول ایجنٹ کے آفس کے شیشے کے دروازے پر PIA کا ایک پوسٹر لگا ہوتا تھا جس پر ایران کے مشہور شاعر عمر خیام کے مقبرے کی تصویر تھی۔ جس پر عمدہ چٹسالی اور کاشی کا کام بنا ہوا ہے۔ اس پوسٹر پر PIA کی ایران کی جانب پرواز کا لکھا تھا لیکن اب پوچھنے پر معلوم ہوا کہ پی آئی اے کی ایران کی جانب پرواز آج کل بند ہے۔ اس بارے میں مجھے میرے پٹارو کے کلاس میٹ خالد مخدوم نے فون کرکے بتایا۔

"آج کل بند ہے؟" میں نے طنزاً مسکراتے ہوئے خالد سے کہا۔

"ہاں، معلوم نہیں کب شروع ہوگی۔" اس نے جواب دیا۔ کوالالمپور کی جانب پرواز بھی بند ہے، ٹوکیو کی جانب بھی بند ہے"....

"تب ہی تو میں نے ظفر خان کو PIA کا چےئرمین ہونے پر مبارک باد دینے کے بجائے عذر خواہی کی۔" میں نے کہا۔ ہمارا دوست ظفر خان نہ صرف ہمارا انٹر تک کلاس میٹ تھا بلکہ خالد مخدوم کا روم میٹ بھی۔ جب ریٹائرمنٹ کے قریب پہنچے یعنی ساٹھ سال کے ہوئے تو ہم تمام بوڑھوں میں ظفر خان اسمارٹ اور صحت مند تھا۔ بہت قابل اور محنتی شخص ہے لیکن PIA جس تباہ شدہ حالت میں اسے چلانے کے لئے دی گئی ہے اس میں خالد مخدوم کو ڈر ہے کہ ظفر کو اب بلڈپریشر سمجھو کہ ہوا۔ بہرحال خالد کی بات پر ابھی بھی مجھے شک تھا کہ PIA کی ایران کی جانب پرواز بند ہوچکی ہے لیکن پھر مشہد میں اچانک PIA کے منیجر جعفری صاحب سے ملاقات ہوگئی۔

"میں نے تو سنا ہے کہ ایران کے لئے PIA سروس بند ہوگئی ہے۔" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔ ٹھیک کہتے ہو۔" اس نے جواب دیا۔ "کافی عرصے سے نقصان میں جارہی تھی سو بند کردی گئی۔ باقی آفس اور اسٹاف یہاں ایران میں موجود ہے۔"

پتہ نہیں کہ ہماری قومی ہوائی کمپنی کی ایران کے لئے سروس کب شروع ہو، تب تک مشہد اور تہران کے اسٹاف اور آفس کا خرچ حکومت اپنی جیب سے بھرتی رہے گی۔ جو لوٹ پھیر کر ہم عوام کو ٹیکسوں کی صورت میں دینا پڑتا ہے۔

پاکستانی عجیب پاگل لوگ ہیں

وہ زائرین جو ہوائی جہاز کے ذریعے ایران پہنچتے ہیں، خاص طور پر مشہد اور قم کے لئے جانے والے یا جو لوگ عراق کے شہر کربلا جاتے ہیں وہ عموماً ایران کی قومی ایئرلائن "ایئر ایران" کے ذریعے تہران پہنچتے ہیں۔ وہاں سے ڈومیسٹک پروازوں کے ذریعے ایران کے مختلف شہروں تک پہنچایا جاتا ہے۔ بعض لوگ بس کے ذریعے بھی کربلا جاتے ہیں جو قم سے خسروی تک بارہ گھنٹے کا اور وہاں سے کربلا تک مزید سات گھنٹے کا سفر ہوتا ہے۔

میں بھی بدھ کے دن روانہ ہونے والی ایئر ایران کی پرواز میں تہران جا رہا تھا۔ اس کے علاوہ دوسری کوئی چوائس بھی نہیں تھی۔ ہماری ہوائی کمپنی "پی آئی اے" کے جہاز آج کل ایران نہیں جاتے۔ گوکہ میں اپنی پچھلی تحریروں میں پی آئی اے اور اس کی سروس پر تنقید کرتا رہا ہوں لیکن حقیقت ہے کہ پی آئی اے کی بعض باتیں قابل تعریف بھی ہیں۔ ایک زمانہ وہ بھی تھا جب پی آئی اے کے سبب بیرونِ ملک ہم پاکستانیوں کی خاصی عزت تھی اور ہمیں تحسین کی نظر سے دیکھا جاتا تھا... اس حوالے سے چند باتیں تحریر کرتا ہوں جو مجھے اس وقت یاد آرہی ہیں:

ایشیائی ملکوں میں پی آئی اے اولین کمپنی تھی جسے سپر Constellation جہاز اڑانے کا اعزاز حاصل ہوا تھا۔ اس کے بعد جیٹ کرافٹ بھی پہلی مرتبہ پی آئی اے نے ہی چلائے تھے۔

- پی آئی اے ایشیا کی پہلی ایئرلائن تھی جسے امریکا کی "فیڈرل ایوی ایشن ایڈمنسٹریشن (FAA) اور برطانیہ کی "سول ایوی ایشن اتھارٹی (CAA) کی جانب سے مرمت کا approval ملا تھا۔
- پی آئی اے پہلی غیر کمیونسٹ ایئرلائن ہے جسے چین میں اسٹاپ کرنے اور ماسکو سے یورپ جانے کا اجازت نامہ ملا تھا۔
- ایشیا کی پہلی ایئرلائن پی آئی اے ہے جس نے اپنے فلیٹ میں بوئنگ 737 اور 771 جہاز شامل کیے۔
- یہی پہلی ہوائی کمپنی ہے جس کے جہازوں میں سفر کے دوران فلمیں دکھانے کی ابتدا ہوئی۔
- پی آئی اے دنیا کی پہلی کمپنی ہے جس نے شیڈول کے مطابق ہیلی کاپٹر سروس شروع کی تھی۔

آپ خود ہی اندازہ کرلیجئے کہ دنیا میں پی آئی اے کی اور اس کی وجہ سے ہم پاکستانیوں کی کس قدر عزت افزائی

ہوئی تھی۔ ہمیں قابل اور باصلاحیت سمجھا جاتا تھا۔ اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ سنگاپور، ملائےشیا اور سری لنکا جیسے ملکوں کی ہوائی کمپنیوں اور پانی کے جہازوں کی ابتدا ہم پاکستانیوں کی مدد سے کی گئی تھی... لیکن آج ہمارے ملک اور ہماری ہوائی کمپنی کا کیا حال ہے، اس سے آپ سب ہی آگاہ ہوں گے۔

پی آئی اے کی ابتدا پاکستان کے وجود میں آنے کے ایک سال پہلے یعنی ۱۹۴۶ءمیں ہوئی تھی۔ اس زمانے میں مرزا ابو الحسن اصفہانی جیسے صنعت کاروں نے کلکتہ میں ”اورینٹ ایئرویز“کے نام سے ایک ہوائی کمپنی رجسٹرڈ کرائی تھی۔ بعد میں اسے کراچی منتقل کردیا گیا تھا۔ اس کمپنی کے جہاز ڈھاکا،کراچی اور کوئٹہ، لاہور کے درمیان پرواز کرتے تھے۔۱۹۵۵ءمیں حکومت کی جانب سے قائم کی گئی نئی قومی ہوائی کمپنی میں اورینٹ ایئرلائنز کو شامل کرکے اسے ”پی آئی اے“کا نام دیا گیا۔ پہلے ہی سال پی آئی اے کے جہاز لندن، قاہرہ اور اٹلی کی جانب پرواز کرنے لگے تھے۔ ۱۹۶۲ءمیں پی آئی اے کے جہاز نیویارک جانا شروع ہوگئے تھے۔

۱۹۶۸ءمیں جب میں نیویارک پہنچا تھا تو وہاں کے آفس منیجر میرے ہم نام الطاف تھے۔ امریکا جیسے ملک میں ہماری ہوائی کمپنی کا بڑا نام تھا۔ دنیا بھر میں صرف ہمارے ہوائی جہاز ہی نہیں بلکہ پانی کے جہاز بھی چلتے تھے۔کاروبار اس قدر ترقی کر رہا تھا کہ ہمارا ملک یکے بعد دیگرے ہوائی جہاز اور پانی کے جہاز خریدتا رہا۔ صورتِ حال یہ تھی کہ جہازوں کو چلانے والے پائلٹ اور انجینئروں کی کمی کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ جب تک پاکستان میرین اکیڈمی سے چیف انجینئر اور کیپٹن وغیرہ تعلیم پاکر کسی قابل ہوتے تب تک ہمارے ملک کے کئی جہازوں پر انگلینڈ، ترکی، پولینڈ اور جرمنی جیسے ملکوں کے چیف انجینئر اور کیپٹن ملازمت کرتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ملائےشیا، سنگاپور، سری لنکا جیسے ملکوں کے پاس نہ اپنے جہاز تھے اور نہ ہی تعلیمی ادارے تھے۔ سعودی عرب سے ملائےشیا تک کے ”نوجوان کیڈٹ“ ہماری نیول اکیڈمی اور میرین اکیڈمی جیسے تعلیمی اداروں سے تعلیم حاصل کرتے تھے۔ بعد میں جب ان ملکوں نے اپنی ہوائی اور بحری جہازوں کی کمپنیاں قائم کیں تو اس سلسلے میں ہمارے ماہرین نے ان کی مدد کی تھی۔ ان ملکوں کے جہاز ہمارے پاکستانی چلاتے تھے اور ان کے اداروں کے سربراہ بھی پاکستانی تھے۔ ان میں سے بعض میرے کلاس میٹ اور سینئر تھے مثلاً ایران کی گوکل کمپنی کے چیف انجینئر انور لودھی تھے۔ اس کے علاوہ مسٹر سیٹنا، ظفر زبیری، کیپٹن عمران انصاری، کیپٹن عرفان فاروقی، کیپٹن مظہر زیدی، چیف انجینئر آصف غیور، ابراہیم شریف، اسلام مصطفی، مرزا اقبال... اور کیپٹن ایم جے سعید جنہوں نے ۱۹۶۸ءمیں آج کی سنگاپور کی جہاز راں کمپنی PIL کی بنیاد رکھی تھی۔ اسی طرح کیپٹن جلال بیگ نے سری لنکا کی ”سیلان کارپوریشن“ قائم کی تھی آج اس کمپنی کے پاس ہم سے زیادہ جہاز ہیں۔

...اور پھر اس کے بعد ہمارے ترقی کا گراف گرنے لگا اور گرتا ہی چلا گیا...

جن لوگوں نے ہم سے تربیت حاصل کی، جن ملکوں نے ہم سے بہت بعد میں جہاز راں کمپنیاں اور میرین اکیڈمیاں قائم کیں وہ ہم سے بہت آگے نکل گئے۔ ہم انہیں دیکھتے ہی رہ گئے۔ نہ جانے ہمارے ملک اور ہمارے اداروں کو کس کی نظر لگ گئی...؟

ایران کی قومی ہوائی کمپنی کا نام "ایئرایران" ہے۔ پی آئی اے کی طرح یہ کمپنی بھی ۱۹۴۶ءمیں وجود میں آئی تھی۔ ایران کے چند تاجروں نے مشترکہ طور پر یہ ہوائی کمپنی شروع کی تھی جو اس زمانے میں "ایرانین ایئرویز" کہلاتی تھی۔ اس کمپنی کے جہاز ملک کے مختلف شہروں تہران، مشہد، اصفہان اور شیراز وغیرہ کے درمیان پرواز کرتے تھے۔ ہفتے میں ایک فلائٹ یورپ کے روٹ پر بھی پرواز کرتی تھی۔ ۱۹۵۴ءمیں ایک اور پرائیویٹ کمپنی "PAS" شروع ہوئی۔ اس کمپنی کے جہاز ۱۹۶۰ءکے بعد ایران کے شہروں کے علاوہ لندن، جنیوا، پیرس، برسلز اور فرینکفرٹ کی جانب بھی جانے لگے تھے۔

۱۹۶۲ءمیں ایران ایئرویز اور پی اے ایس کا اختلاط ہوا اور "ایران ایئر" کے نام سے ملک کی قومی ایئر لائن وجود میں آئی۔ ہم ایران جانے کے لئے اسی کمپنی کے جہاز "ایئر بس 300" میں محوِسفر تھے۔ نیچے ہمارے ملک کے صوبے بلوچستان کے شہر شہباز قلات، پنجگور، قلعہ خرابدن، واشاپ، دوزاب اور قلعہ لدگاشت گزر رہے تھے۔

تہران پہنچنے کے لئے ہوائی جہاز بلوچستان کی فضاؤں سے گزر کر ایران کی حدود میں داخل ہوتا ہے۔ ایران میں داخل ہوتے ہی جہاز کا رُخ بم، کرمان اور یزد شہروں کی جانب ہو جاتا ہے۔ پھر اصفہان اور قم شہروں کے اوپر پرواز کرتا ہوا تہران پہنچتا ہے۔ مشہد جانے کے لئے جہاز کو پھر شمال مشرق کی جانب سفر کرنا پڑتا ہے۔

ایران کا شہر زاہدان بلوچستان کے بارڈر کے قریب ہے۔ آپ کو زاہدان کے علاقے میں ہمارے بلوچ بھائی جابجا نظر آئیں گے۔ اسی طرح مشہد شہر افغانستان اور ترکمانستان کی سرحد کے قریب ہے۔ وہاں ان ملکوں کے لوگ نظر آتے ہیں۔ اس علاقے میں رہنے والے مقامی ایرانی بھی افغانی اور ترکمانی نقش لیے افغانی اور ترکی زبانیں بولتے ہوئے ملیں گے۔ مغرب میں ایران کا شہر 'تبریز' ترکی اور آذربائیجان کی سرحدوں کے بالکل قریب ہے۔ تہران کا محل وقوع ایران کے وسط میں ہے اور دنیا کا خوبصورت اور دلکش موسم کا حامل Caspian سمندر اس شہر کے بالکل قریب ہے جسے فارسی میں "دریائے خزر" کہتے ہیں۔

ایران کی قومی ایئرلائن "ایئر ایران" کو فارسی زبان میں "ہوا پیمائی ملی ایران" کہا جاتا ہے۔ اس کمپنی میں آج کل کئی چھوٹے بڑے اور ماڈرن جہاز شامل ہیں جو اپنے ملک کے شہروں کے علاوہ دنیا کے کئی ملکوں میں جاتے ہیں۔

امریکا اور یورپ کی جانب سے عائد کی گئی کئی بے جا پابندیوں کے باوجود ایران پُرعزم ہے اور ہر راہ پر ترقی کر رہا ہے۔ یہ دنیا کے لئے حیرت کی بات ہے۔ ہم اس سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔

ہمارے ایک آسٹریلین دوست ایران سے بہت متاثر ہیں۔ وہ مذاق ہی مذاق میں ہم سے اکثر کہتے ہیں ”ایران جیسا ملک تمہارے پڑوس میں واقع ہے۔ تم اسے دیکھ کر بھی نہیں سُدھرتے۔"

اس ملک میں ”ایئر ایران“ کے علاوہ چند دوسری پرائیویٹ فضائی کمپنیاں بھی قائم ہیں۔ ان میں ”ماہان ایئر“ نمایاں ہے اور اس کمپنی کے جہاز اندرون ملک کے علاوہ بیرون ملک بھی سروس فراہم کرتے ہیں جس طرح ہمارے ہاں شاہین، ایر بلو لائن وغیرہ جیسی پرائیویٹ کمپنیاں موجود ہیں... لیکن ”ماہان اےئر“ کمپنی کے پاس بیس سے زائد جہاز ہیں۔

ایران میں ایک دوسری ہوائی کمپنی "Kish Air" کے نام سے بھی قائم ہے جس کی ابتدا ۱۹۸۹ءسے ہوئی تھی۔ اس اےئر کمپنی کی ایک یہ خصوصیت بھی ہے کہ ایران میں اس کے چند تعلیمی ادارے بھی قائم ہیں۔ میں جس جہاز میں سفر کر رہا تھا اس کی ایک اےئرہوسٹس سے میں نے پوچھا تھا ”آپ نے ایسی اچھی انگریزی بولنا کہاں سے سیکھی ہے؟"

اس نے بتایا کہ کیش اےئر کی جانب سے قائم شدہ انسٹی ٹیوٹ سے تربیت حاصل کی تھی۔

"کیش اےئر“ والوں نے اپنی کمپنی والوں کو انگریزی سکھانے کے لئے تعلیمی ادارے قائم کےے تھے۔ لیکن معیار بہتر ہونے کے سبب یہاں کئی دوسری کمپنیوں کے ملازمین بھی تعلیم حاصل کرتے تھے۔

"کیش اےئر والوں کے پاس بارہ جہاز ہیں اور ان کے ملازمین کی کل تعداد ۳۱۰ ہے۔“ اےئر ہوسٹس نے مزید بتایا تھا۔

ملازمین کے حساب سے جائزہ لیا جائے تو ہماری پی آئی اے سب میں امیر ترین فضائی کمپنی ہے۔ اس کمپنی کے بعض جہاز ”ضعیفی“ کے سبب گھٹنوں کے بل پڑے ہوئے ہیں۔ کئی شہروں کی طرف جانے والی پروازیں بند کردی گئی ہیں... لیکن پی آئی اے کے تنخواہ دار ملازمین کی تعداد تقریباً ۱۹۳۰۰ ہے۔ جس ایرانی کمپنی کے جہاز میں ہم سفر کر رہے تھے اس کے ملازمین کی تعداد صرف ۷۵۰۰ ہے۔

"ساہا اےئر“ نامی ایک اور ایرانی ہوائی کمپنی ہے جس کے ایک بوئنگ 707-300 کو ۲۰ اپریل ۲۰۰۵ءکو تہران کے پرانے ہوائی اڈے مہرآباد میں حادثہ پیش آیا تھا۔ لینڈنگ کے دوران جہاز میں کوئی فنی خرابی پیدا ہوگئی تھی اور وہ خاصی تیز رفتاری سے رن وے پر اتر رہا تھا۔ لینڈنگ کے دوران ہی جہاز رن وے کے آخری سرے سے گزر کر

جھیل میں جاگرا تھا۔ اس حادثے میں ایک مسافر اور جہاز کے عملے کا ایک فرد ہلاک ہوگئے تھے۔

بہرحال ایئر ایران کے اس جہاز میں سفر سکون سے گزرا تھا۔ مجھے اس بات پر حیرت ہوئی تھی کہ مسافروں کو جو کھانا پیش کیا گیا تھا وہ ہمارے جہازوں سے، حتیٰ کہ امارات کے جہازوں سے بھی بہتر تھا۔ اس سے پہلے میرا خیال تھا کہ امارات کے جہازوں میں سب سے بہتر کھانا پیش کیا جاتا ہے۔ لیکن ایئر ایران کے اس جہاز میں مجھے اپنی رائے پر نظرثانی کرنی پڑی۔

اس سے آگے یعنی تہران سے مشہد کے سفر میں سینڈوچ اور اسنیکس پیش کیے گئے تھے جبکہ وہ سفر محض ایک گھنٹے کا تھا۔ سینڈوچ اور اسنیکس لذت میں تو بہتر تھے ہی مقدار کے لحاظ سے بھی کافی تھے۔ کافی اور چائے کے علاوہ جوس کا ایک ڈبا اور پستوں کا پیکٹ بھی ہر مسافر کو پیش کیا گیا تھا۔ کھانے سے جو خوشبو اٹھ رہی تھی اس کے بارے میں میرے قریب بیٹھے ہوئے ہم سفر نے بتایا تھا ”یہ خوشبو زعفران کی ہے۔ ایران میں زعفران اور پستہ کی پیداوار بہت زیادہ ہوتی ہے۔“ میرے پاکستانی ہم سفر کا نام رحمت علی تھا اور وہ کینیڈین شہریت کے حامل تھے۔ ”میرے کئی دوستوں نے ایران سے زعفران لانے کی فرمائش کی تھی۔“ رحمت علی نے کہا تھا۔

اس سے قبل میں سمجھتا تھا کہ زعفران کی پیداوار صرف اسپین میں ہوتی ہے۔ جہاز چلانے کے دنوں میں جب بھی میرا اسپین کی بندرگاہ بارسلونا اور کناری (Canary) جزائر جانے کا اتفاق ہوتا تھا تو وہ وہاں سے میں اپنے دوست ہرکشن کے لئے زعفران ضرور خریدتا تھا۔ ہرکشن ہندو سندھی ہے اور اپنی فیملی کے ساتھ سنگاپور میں رہائش پذیر ہے۔

سخت خول والے پستے ہم نے اکثر دیکھے تھے جو خشک میوہ جات ”ڈرائی فروٹ“ میں شامل ہیں۔ اگر وہ ”ڈرائی فروٹ“ ہے تو تازہ پستہ ”فریش فروٹ“ کہلائے گا۔ بہرحال میرا خیال ہے کہ ہم میں سے بعض نے وہ نہیں دیکھے ہوں گے۔ میں نے بھی ”تازہ پستے“ ایران میں ہی دیکھے۔ جب ہماری بس دیہی علاقوں سے گزرتی تھی تو ہمارے گروپ کے ایک ساتھی سجاد مُکھی وہاں سے پستے خرید کر ہمیں کھلاتے رہے۔ سجاد اس سے پہلے کئی مرتبہ ایران، عراق اور شام آچکے ہیں۔ پستوں کا ذائقہ وہی ہوتا ہے لیکن ان پر دو حصوں میں سخت خول ہونے کے بجائے نرم اور سبز چھلکا ہوتا ہے جس کے اندر پستہ ڈھکا ہوا ہوتا ہے۔ یہ چھلکا ناخن کی مدد سے بہ آسانی الگ ہو جاتا ہے۔

اس سفر میں ایک بدمزگی ضرور ہوئی تھی۔ کھانا کھانے کے بعد ہمارے سامنے بیٹھے ہوئے ایک پاکستانی مسافر نے سگریٹ سلگا لیا تھا۔ آج کل مختصر دورانیے کے فضائی سفر میں سموکنگ پر مکمل طور پر پابندی ہے۔ دس، بارہ گھنٹے کے سفر میں سگریٹ نوش افراد کے لئے ایک حصہ مخصوص ہوتا ہے۔ وہاں جاکر وہ سگریٹ پی سکتے ہیں۔ سگریٹ کے پہلے ہی کش سے زعفران اور موتیے کی خوشبو سے مہکتے ہوئے جہاز کی فضا میں انتشار سا پیدا ہوگیا۔

"دھواں نظر آرہا ہے۔" ایک آواز ابھری۔

"سگریٹ کی بُو آرہی ہے۔" ایک نسوانی آواز نے احتجاج کیا۔

میرے قریب بیٹھے ہوئے رحمت علی نے میری طرف جھکتے ہوئے سرگوشی میں کہا "شاید کوئی سگریٹ پی رہا ہے۔"

جلد ہی معلوم ہوگیا کہ وہ "کوئی" میرے آگے والی قطار میں میرے بالکل آگے بیٹھا تھا۔ ایئرہوسٹس بھی اسے تلاش کرتی ہوئی وہاں آ پہنچی تھی۔ اے‏ئرہوسٹس نے اسے سگریٹ نوشی سے منع کیا لیکن ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اے‏ئرہوسٹس کی بات اس شخص نے سنی ہی نہیں۔ وہ ڈھٹائی سے مسلسل سگریٹ کے کش لیتا رہا۔ اے‏ئر ہوسٹس چلی گئی اور تھوڑی دیر بعد ایک مرد اسٹیورڈ کو لے آئی۔ اس نے مسافر کو سگریٹ ایش ٹرے میں بجھانے کی ہدایت کی۔ لیکن اس نے سگریٹ کو مٹھی میں چھپالیا۔ اسٹیورڈ کے پلٹتے ہی اس نے دوبارہ کش لیا۔ اس کی یہ حرکت اسٹیورڈ نے دیکھ لی۔

"سگریٹ بجھا دیں، ورنہ میں آپ کو ہتھکڑی لگا دوں گا۔" اسٹیورڈ نے غصے سے کہا اور تیز قدموں سے پائلٹ کیبن کی طرف بڑھا۔ تب جاکر اس شخص نے سگریٹ بجھایا اور شرافت سے بیٹھ گیا۔

میری طرح دوسرے پاکستانیوں کو بھی یقینا افسوس ہوا ہوگا۔ انہوں نے بھی یہی سوچا ہوگا کہ ایک مچھلی پورے تالاب کو گندا کردیتی ہے... یا اس طرح کہنا چاہئے کہ ایک مسافر جہاز کے پورے ماحول کو خراب کردیتا ہے۔ جہاز کے ایرانی کیبن کریو اور اردگرد بیٹھے ہوئے ایرانی مسافروں نے ہمارے بارے میں کیا رائے قائم کی ہوگی؟ ایک شخص کے غلط رویے کی وجہ سے پورے ملک کی بدنامی ہوتی ہے۔ ایرانی مسافر یہ نہیں کہیں گے کہ ایک مسافر نے غلط حرکت کی تھی... وہ یقینا یہی کہیں گے...

"پاکستانی عجیب پاگل لوگ ہیں۔"

بندر روڈ پر گلاب کے پانی سے چھڑکاؤ کیا جاتا تھا

ایران کی کئی اچھی باتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ یورپ کی طرح یہاں بھی صبح سویرے دکانیں کھل جاتی ہیں۔ جبکہ ہمارے ہاں گیارہ بجے اور بعض بازار بارہ بجے کھلتے ہیں۔ یعنی کسی کو کوئی چیز خریدنی ہو تو اسے آفس اور فیکٹری کا کام چھوڑ کر نکلنا پڑتا ہے۔ اس وقت ٹریفک جام رہتا ہے اور گاڑی پارک کرنے کا مسئلہ الگ ہوتا ہے۔ ایران میں ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ یہاں صبح سات بجے ہی خریداری کرلی جاتی ہے اور ہر شخص آٹھ بجے دفتر اور فیکٹری وغیرہ پہنچ جاتا ہے۔

مشہد اور قم میں تو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ دکانیں بند کس وقت ہوتی ہیں یا شاید بند ہی نہ ہوتی ہوں۔ میں جس وقت بھی ہوٹل سے باہر آتا تھا تو مجھے دکانیں کھلی ہوئی نظر آتی تھیں۔ ہر بازار اور ہر گلی میں خریداروں کی بھیڑ ہوتی تھی۔ خریداروں میں مردوں کی نسبت خواتین کی تعداد زیادہ تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ یہاں امن امان کی صورتِ حال خاصی بہتر، بلکہ قابلِ رشک ہے۔ لوگ رات بھر امام علی رضاؑ کے روضے اور مسجد گوہر شاد میں جاتے نظر آتے تھے اور واپسی پر خریداری میں مشغول ہو جاتے تھے۔

مجھے صبح کے وقت اپنے اسٹائل کی چائے کی بڑی سخت طلب ہوتی تھی لیکن ایسی "عیاشی" اور مزے صرف اپنے ملک اور اپنے گھر میں ہی ہو سکتے ہیں یا ہندوستان میں۔ ہمارے ہاں کی طرح انڈیا کے بھی ہر گاؤں، قصبے اور گلی گلی میں واقع ہوٹلوں میں چائے کے لئے دودھ کا پتیلا ہر وقت چولہے پر رکھا نظر آتا ہے۔ آنے جانے والے لوگ وہاں سے کپ یا گلاس میں چائے لے کر پیتے ہیں اور آفس، فیکٹری یا مزدوری پر روانہ ہو جاتے ہیں۔

بہرحال یہ بھی غنیمت تھا کہ ہوٹل کے ہر فلور پر ایک مختصر سا کچن اور کئی ہوٹلوں کے کمروں میں بھی کچن موجود ہیں تاکہ ضرورت کے تحت وہاں چائے وغیرہ تیار کی جاسکے۔ آج کل "دودھ پتی" چائے بنانے کے لئے فریش دودھ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کئی برانڈ کے خشک دودھ کے پیکٹ اور کافی میٹ بہ آسانی مل جاتے ہیں۔ جن سے اپنی پسند اور طلب کے مطابق دودھ پتی چائے بھی بنائی جاسکتی ہے۔ میں نے بھی لپٹن چائے کی تھیلیاں اور نیسلے خشک دودھ کے ۴۰۰ گرام والے "ایوری ڈے" پیکٹ اپنے ساتھ رکھے تھے۔ جب بھی مجھے طلب ہوتی تھی میں اپنی پسند کے مطابق چائے بناکر پیتا تھا۔

ملائیشیا میں چائے کے بجائے کافی عام ہے اور جہاں چائے دستیاب ہوتی ہے وہاں انتہائی میٹھے اور گاڑھے دودھ سے

چاشنی جیسی چائے بنائی جاتی ہے۔

ایران میں جگہ جگہ سلیمانی چائے یعنی بغیر دودھ والی کالی چائے ملتی ہے۔ اس میں چینی ملا کر نہیں بلکہ "شوگر کیوب" منہ میں رکھ کر پی جاتی ہے۔ کیوب کو منہ میں اس طرح رکھا جاتا ہے کہ ہر گھونٹ کے ساتھ ضرورت کے مطابق مٹھاس شامل ہوکر حلق سے اترتی ہے۔ اس کیوب کو فارسی میں "قند" کہا جاتا ہے۔ یورپ میں میرے ساتھ چند ایرانی بھی رہتے تھے۔ وہ کینٹین اور گھر میں اسی طرح چائے پیتے تھے۔ سویڈن میں دو سالہ رہائش کے دوران میرا جن ایرانیوں سے تعلق رہا تھا وہ کھانے کی ابتدا گجراتیوں کی طرح میٹھے یعنی سویٹ ڈش سے کرتے تھے۔

ایران میں صبح سویرے مردوں اور عورتوں کی کثیر تعداد نان خریدنے میں مصروف نظر آتی ہے۔ ایران میں آٹا حکومت کے کنٹرول میں ہے۔ ہر شہر کی گلی گلی میں سرکاری بیکریاں قائم ہیں۔ جہاں سے قطار بناکر مختلف اقسام کے نان خریدے جاتے ہیں۔ اس حوالے سے مغربی پریس ایرانی حکومت پر تنقید بھی کرتا رہتا ہے۔ لیکن ہمارے ملکوں کی طرح ایران میں آٹے کی قلت یا بحران کی صورتِ حال ہرگز پیش نہیں آتی اور نہ اس کی قیمت غریبوں کی استطاعت سے باہر ہوتی ہے۔

پاکستان ایک زرعی ملک ہے جہاں اناج میں گندم آسانی سے اور وسیع پیمانے پر پیدا ہوتی ہے۔ وہاں پتلی سے روٹی بھی چار روپے میں ملتی ہے اور تندوری نان پانچ روپے سے کم نہیں ہے۔ ایران میں ہمارے ہاں کی روٹی سے تین گنا بڑا نان صرف پاکستانی دو روپے میں ملتا ہے۔ اس کے علاوہ روغنی نان بھی ملتے ہیں لیکن ان کی قیمت کچھ زیادہ ہوتی ہے۔ ایک غریب کو تقریباً پانچ منٹ قطار میں کھڑا ہونا پڑتا ہے لیکن کم پیسوں میں روزانہ اس کا پیٹ تو بھر جاتا ہے۔

کئی لوگ صبح قدرے جلدی آکر قطار میں کھڑے ہوجاتے ہیں اور تیس چالیس نان خرید کر ان بیکریوں کے سامنے ہی سڑک کے کنارے بیٹھ جاتے ہیں۔ وہ کچھ فائدہ رکھ کر نان فروخت کرتے ہیں۔ حکومت اس بات کو پسند نہیں کرتی۔ آئے دن چھاپے پڑتے رہتے ہیں اور پکڑ دھکڑ بھی ہوتی ہے لیکن یہ "کام" جاری رہتا ہے۔ اس سے ایک فائدہ ضرور ہے۔ جو لوگ قطار میں کھڑے ہونے کی زحمت سے بچنا چاہتے ہیں یا اسے وقت کا زیاں سمجھتے ہیں وہ فٹ پاتھ سے نان خرید کر چلے جاتے ہیں۔ فروخت کرنے والے غریب کو کچھ آمدنی ہوجاتی ہے اور خریدار دو کے بجائے تین روپے کا نان خرید کر بھی گویا فائدے میں رہتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ مختلف بیکریوں میں مختلف قسم کے نان تیار کیے جاتے ہیں۔ مثلاً کہیں موٹے نان تیار کیے جاتے ہیں اور کہیں پتلے اور لمبے، کہیں سادہ نان دستیاب ہوتے ہیں اور کہیں تِلوں والے نان۔ روغنی نان کے لئے بھی بیکریاں مخصوص ہیں... لہٰذا جس خریدار کو دو یا تین مختلف قسم کے نان درکار ہوں تو بیکری کے سامنے فٹ پاتھ پر بیٹھے ہوئے شخص سے لے سکتا ہے۔ دوسری صورت میں اسے ایک بیکری سے ایک قسم کے نان خرید کر دوسری بیکری کے سامنے قطار میں کھڑا ہونا پڑے گا۔ اس سے بہتر یہی ہے کہ معمولی

اضافی رقم ادا کرکے تمام مطلوبہ نان ایک ہی جگہ سے خریدے جائیں۔ فٹ پاتھ پر نان فروخت کرنے والوں کے پاس ہر قسم کے نان ہوتے ہیں۔ وہ مختلف بیکریوں سے مختلف قسم کے نان خرید کر ایک جگہ بیٹھ جاتے ہیں۔

"نان" دراصل فارسی کا لفظ ہے جو برصغیر کی کئی زبانوں میں جذب ہو چکا ہے۔ نان یعنی روٹی... اسی سے متعلق فارسی کے دوسرے الفاظ سندھی، اردو، پنجابی اور ملئی زبانوں میں استعمال ہوتے ہیں مثلاً "نان بائی" یعنی روٹی پکانے والا، "نان دان" روٹی رکھنے والا جالی دار ریک... "نان ختائی" میٹھا بسکٹ، "نان فروش" روٹی فروخت کرنے والا وغیرہ وغیرہ۔

مشہد میں مقامی لوگ نان کو "نون" کہتے ہیں۔

آج کل ایران کی مارکیٹیں اور بازار چینی اشیاء سے بھری ہوئی ہیں۔ ایران کے دیہی علاقوں سے آنے والے زائرین اور اردگرد کے ملکوں، افغانستان، آذربائیجان، ازبکستان، آرمینستان اور ترکمانستان سے آئے ہوئے "زوار" چین کی تیار کی ہوئی چیزوں کو شوق سے خریدتے ہیں۔

آج سے پانچ چھ برس قبل ہمارے پاکستانی اس قسم کے ٹیپ رکارڈ، کیلکولیٹر، گھڑیاں، قلم، کھلونے، ٹارچ، ٹیلی فون سیٹ اور اسٹیشنری کا فینسی سامان سعودی عرب، ہانگ کانگ، سنگاپور اور دبئی سے خرید لاتے تھے۔ لیکن اب یہی سامان کراچی کے جمعہ بازار اور اتوار بازار میں نسبتاً کم قیمت میں مل جاتا ہے۔ کھوڑی گارڈن، بولٹن مارکیٹ اور موتن داس مارکیٹ میں چائنا پروڈکٹس مزید سستے داموں ملتی ہیں۔ لہٰذا میرے مشاہدے میں آیا کہ پاکستانی لوگ ایران میں کسی چیز کی خریداری میں زیادہ دلچسپی نہیں رکھتے... بلکہ مرد تو کچھ خریدتے ہی نہیں نہیں البتہ خواتین برقعے کی جگہ اوڑھنے کے لئے چادریں اور سر ڈھانپنے کے لئے حجاب خریدتی ہیں۔ جسے یہاں "روسری" کہا جاتا ہے۔

یہاں ایک بہترین چادر کی قیمت چار سے نو ہزار تومان، یعنی تین سے چھ سو روپے ہے۔ پاکستان کا ایک روپیہ ایران کے پندرہ تومان یا ۱۵۰ ریال کے برابر ہے۔ ایرانی کرنسی پر تومان کے بجائے ریال لکھا ہوا ہے۔ یعنی نو ہزار تومان کی چادر خریدنے کے لئے آپ کو نوے ہزار ریال ادا کرنے پڑیں گے۔ سر ڈھانپنے کے اعلیٰ قسم کے ایرانی حجاب ڈیڑھ ہزار سے تین ہزار تومان (سو روپے سے دو سو روپے) میں مل جاتے ہیں۔

پاکستانی لوگ ایران سے حجاب اور چادروں کے علاوہ جو دوسری چیز خریدتے ہیں وہ زعفران ہے۔ ایران کے خشک میوہ جات میں پستہ خاص طور پر زیادہ مشہور ہے۔ عرب اور افریقی ملکوں کے زائرین خوب پستے خریدتے ہیں لیکن پاکستانی نہیں۔ کیونکہ خشک میوہ جات ہمارے ہاں بھی تقریباً اسی قیمت پر ملتے ہیں۔ یہاں اور پاکستان میں پستہ،

بادام، کشمش اور اخروٹ وغیرہ کی قیمتوں میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔

چند سطور زعفران کے بارے میں...

زعفران کو انگریزی میں Saffron اور برصغیر میں اسے ”قیصر“ بھی کہا جاتا ہے۔ زعفران نہ صرف برصغیر میں بلکہ جاپان، چین، کوریا اور ملائیشیا سے مصر اور مراکش تک مرغوب و مقبول ہے۔ گزشتہ چند صدیوں سے یورپ حتیٰ کہ امریکا تک میں زعفران کی وقعت و اہمیت ہے۔ اس حد تک کہ انڈیا، ایران اور مراکش سے زیادہ زعفران کی کاشت یونان، اٹلی اور اسپین میں ہوتی ہے۔ زعفران کو دنیا میں The Golden Spice کہا جاتا ہے۔ زعفران کو زیادہ کھانوں میں خوشبو کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اور دوسرے نمبر پر یہ دواؤں کے کام بھی آتی ہے۔ چین، جاپان اور انڈیا کی کئی قوموں میں یہ خیال عام ہے کہ حاملہ عورت کو دودھ میں زعفران ملاکر پلایا جائے تو بچہ خوبصورت پیدا ہوگا۔

زعفران پھولوں کے وسط میں گیروے کے باریک دھاگوں کی صورت میں ہوتی ہے۔ یہ پھول ”سیفرون کروکس“ کہلاتا ہے۔ اس کا سائنسی نام Crocus Sativus ہے۔ برصغیر میں یہ جموں اور کشمیر میں پایا جاتا ہے۔ ہر پھول سے ایک انچ یا ڈیڑھ انچ کے چار یا پانچ زعفران کے دھاگے حاصل ہوتے ہیں جنہیں خشک کیا جاتا ہے۔

اسپین کے شہر بارسلونا کی ایک دکان سے میں اپنے دوستوں کے لئے زعفران خریدتا تھا۔ دکان کے مالک نے ایک مرتبہ ہمارے جہاز کے تمام عملے کو اس فارم پر مدعو کیا تھا جہاں وہ زعفران کی کاشت کرتا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ سو گرام زعفران حاصل کرنے کے لئے تقریباً چھ، سات ہزار پھول درکار ہوتے ہیں۔ اس لئے زعفران کو دنیا کا مہنگا ترین مسالہ کہا جاتا ہے۔ اس نے مزید بتایا تھا کہ زعفران کی اصل دھرتی ایران کا صوبہ خراسان ہے اسی صوبے میں شہر مشہد بھی واقع ہے۔

میں ایک دن ٹیکسی کے ذریعے مشہد سے نیشاپور جا رہا تھا۔ جہاں عمر خیام اور فرید الدین عطار جیسے شاعروں کے مقبرے ہیں۔ راستے میں جب ہم قدم گاہ سے پہلے ملک آباد نامی قصبے میں پہنچے تو ٹیکسی ڈرائیور نے وہاں ٹیکسی روک کر سائلنسر کا پائپ ویلڈ کرایا تھا۔ وہ دیہی علاقہ تھا جہاں ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھے ہوئے کسانوں نے بتایا تھا کہ ان کی گزر بسر زعفران کی کاشت پر ہے۔

"موجودہ صدر محمود احمدی نژاد سے پہلے ہمیں فصل کی قیمت بہت کم ملتی تھی۔“ ایک کسان نے بتایا تھا۔ ”زیادہ منافع بیچ کے دلال کھا جاتے تھے۔ لیکن اب حکومت براہِ راست ہم سے زعفران خریدتی ہے۔ اب ہمیں نہایت مناسب قیمت مل جاتی ہے۔ اب ہم بہت خوش ہیں اور خوشحال زندگی گزار رہے ہیں۔"

ہمارا ڈرائیور مترجم کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ اس نے کسانوں کی گفتگو کا ترجمہ کرتے ہوئے بتایا تھا کہ زعفران کی کاشت میں خاصی محنت صرف ہوتی ہے۔

"اس صوبے خراسان کے علاوہ کرمان میں بھی تقریباً چھ ہزار ہیکٹرز پر زعفران کاشت کی جاتی ہے۔ انتہائی سخت موسم میں زعفران کی فصل اچھی ہوتی ہے... یعنی موسم گرما میں گرم اور خشک اور سرما میں انتہائی سرد موسم زعفران کی فصل کے لئے بہتر ہوتا ہے۔"

زعفران کی کاشت کے لئے زمین کا ہموار اور درختوں کے بغیر ہونا لازمی ہے۔ تاکہ پودوں پر سورج کی کرنیں براہِ راست پڑ سکیں۔ انہوں نے بتایا تھا کہ ایرانی کاشتکار زعفران کی فصل میں کوئی بھی ولایتی کھاد (فرٹیلائزر) استعمال نہیں کرتے۔ گویا ان کی فصل صد فی صد Organic ہے۔

"زعفران کی کاشت اور اس کی کٹائی انتہائی محنت طلب اور مشکل ہوتی ہے۔ اس کام کے لئے کئی افراد کی ضرورت ہے۔" ایک کسان نے بتایا تھا۔ "کٹائی کے وقت ایک ایک پھول کاٹا جاتا ہے پھر ان میں سے خوشبودار زعفران کے دھاگے (Stigmas) نکالے جاتے ہیں۔ یہ کام علی الصبح یعنی سورج طلوع ہونے سے پہلے پہلے مکمل کیا جاتا ہے۔ پھولوں کے صحیح طرح کھلنے کی مدت صرف پندرہ تا بیس دن ہوتی ہے۔"

پھولوں سے زعفران کے دھاگے حاصل کرنے کے بعد انہیں سائے میں ایسی جگہ رکھا جاتا ہے جہاں مطلوبہ تپش اور خشک ہوا کا گزر ہو۔ انہیں پانچ سے سات دن تک خشک کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد زعفران کی پیکنگ کی جاتی ہے۔

میں نے ایران میں ایک اچھی بات یہ بھی دیکھی کہ یہاں کے دیہات میں ملائیشیا اور پنجاب کی طرح کھیتوں میں مرد کسانوں کے ساتھ خواتین بھی کام کرتی ہیں۔ یعنی کھیتی باڑی کے کام میں ان کی بیویاں اور بیٹیاں بھی ہاتھ بٹاتی ہیں۔ ہمارے ہاں سندھ میں کچھ عرصہ پہلے تک پُھٹی (روئی) کی چُنائی وغیرہ کسانوں کی عورتیں کرتی تھیں۔ لیکن اب یومیہ اجرت دے کر یہ کام بھی باگڑی مزدوروں اور ان کی عورتوں سے کرایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ٹی وی اور کیبل نیٹ ورک کی وبا ہر جگہ پھیل چکی ہے جس سے دیہی علاقے بھی محفوظ نہیں رہے۔ اب سندھ کے ہاری سے منہ اندھیرے نہیں اٹھا جاتا۔ رات کو دیر تک ٹی وی دیکھنے کے بعد جب صبح کو اس کی آنکھ کھلتی ہے تو سورج خاصا بلند ہو چکا ہوتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ محنت کی کمی کے باعث ان کی آمدنی میں بھی خاصی کمی آچکی ہے۔ حالانکہ ٹی وی یہاں ایران میں اور اُدھر ملائیشیا میں بھی موجود ہے۔ لیکن یہاں کا کسان اور محنت کش آج بھی رات کو جلدی سوتا ہے اور صبح سویرے بیدار ہو جاتا ہے۔

گزشتہ صفحے پر مذکور بارسلونا (اسپین) کے دکاندار اور زعفران کی کاشت کرنے والے زمیندار نے بتایا تھا کہ اس کے ملک میں زعفران کاشت کرنے کی ابتدا اسپین میں آنے والے مسلمانوں نے سن **۹۶۱**ءمیں کی تھی۔

اسی طرح دنیا کے دیگر ملکوں میں بھی زعفران کی کاشت عام ہوئی۔ آج کل امریکا میں رہنے والے ایرانی کیلی فورنیا ریاست میں زعفران کاشت کرنے کا تجربہ کر رہے ہیں۔ بہرحال ہر ملک میں وہاں کی دھرتی، مٹی اور موسم کے لحاظ سے کچھ مختلف رنگ اور خوشبو والی زعفران پیدا ہوتی ہے۔ لیکن بنیادی طور پر اس کے معیار کا موازنہ ایران کے علاقے خراسان میں پیدا ہونے والی زعفران سے کیا جاتا ہے۔

انڈیا اور دوسرے بعض ملکوں میں زعفران کپڑے رنگنے کے کام بھی آتی ہے۔ کیوں کہ اس میں موجود Crocin کیمیکل رنگ کے کام آتا ہے۔ انڈیا میں گزشتہ زمانے میں خاص کپڑے زعفران سے رنگے جاتے تھے۔ گوتم بدھ کے انتقال کے بعد ان کے پیروکاروں نے اپنے کپڑوں کا زعفرانی (گیروے) رنگ مقرر کیا تھا۔

زعفران قدیم زمانے سے مسالے، رنگ اور خوشبو کے طور پر استعمال ہوتی چلی آ رہی ہے۔ قلوپطرا کی کہانی پڑھنے والوں کو معلوم ہوگا کہ وہ زعفران ملے ہوئے پانی کے ٹب میں غسل کرتی تھی۔ مصر کے حکیم بادی، قبض او رپیچش کا علاج زعفران سے کرتے تھے۔ یونان کے شاہی محل، عدالتوں، تھیٹر اور رقص گاہوں کو زعفران سے معطر کیا جاتا تھا۔ وہ بھی کیا دن تھے... جب نیرو اٹلی کے شہر روم میں داخل ہوا تھا تو روم کی گلیوں کو زعفران سے دھویا گیا تھا۔ ہمارے لئے کراچی کے وہ دن بھی قابل ذکر ہیں جب کراچی کے میئر جمشید نسروانجی تھے۔ ان ایام میں بندرروڈ (سعید منزل سے ٹاور تک) سڑک پر گلاب کے پانی سے چھڑکاؤ کیا جاتا تھا!...

ایران کی کرنسی اور اخبارات

کسی نئے ملک کی معلومات وہاں کے پرنٹ میڈیا اور الیکٹرونک میڈیا سے حاصل ہو سکتی ہےں۔ میں جب بھی کسی نئے ملک میں جاتا ہوں تو سفر کے دوران میری یہی کوشش ہوتی ہے کہ جہاز ہی میں اس ملک کا اخبار مل جائے۔کیوں کہ جہاز میں جو اخبار دستیاب ہوگا وہ اس ملک کا مشہور، بڑا اور کثیرالاشاعت اخبار ہی ہوگا۔

جہاز میں بیٹھتے ہی ایک ایئرہوسٹس مسافروں میں اخبارات تقسیم کرتی ہوئی نظر آئی۔میری سیٹ جہاز کے آخری حصے میں تھی۔ اس خیال سے کہ مجھ تک پہنچتے پہنچتے اخبارات ختم نہ ہو جائےں، میں نے کھڑے ہوکر اشارہ کرکے ایئرہواسٹس سے اخبار طلب کیا۔ وہ ایک اخبار بچاکر مجھے دے گئی۔ اس کے پاس دس بارہ ہی اخبارات تھے۔ میرے علاوہ کسی نے بھی اخبار طلب نہیں کیا تھا اور نہ ہی اخبار ملنے پر کسی کے چہرے پر خوشی کی لہر آئی تھی۔ اس بات سے اندازہ ہو اکہ جہاز میں سوار تمام پاکستانی اور ایرانی مسافر اخبار کے مطالعے میں دلچسپی نہیں رکھتے۔ویسے بھی اس جہاز میں تقریباً نوے فی صد ایسے لوگ سفر کر رہے تھے جو ذہنی طور پر عبادت کی طرف مائل تھے۔ اخبارات میں عموماً ایسے لوگ دلچسپی رکھتے ہیں جو کاروباری اور ملازمت پیشہ ہوتے ہیں۔ اس جہاز پر اگر کوئی ایسا آدمی موجود تھا تو وہ بھی دنیاوی باتوں سے زیادہ مقدس مقامات کی زیارت اور عبادات وغیرہ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

اس جہاز میں سوار میرے زیادہ تر ہمسفر اپنے لباس اور وضع قطع سے غریب معلوم ہوتے تھے۔ غربت کے باوجود انہوں نے کفایت سے کام لے کر اتنی رقم جمع کرلی تھی کہ اب وہ لوگ اپنے مذہبی اور مقدس مقامات کی زیارت کے لئے جارہے تھے... افسوس کہ میں اپنے ذہن کو اس طرف مائل نہ کرسکا۔ میں اس سفر میں وہ جذبات محسوس نہیں کر رہا تھا جو عمرے اور حج کے سفر کے دوران تھے۔ شاید اس لئے کہ میں ایران کا یہ سفر صرف مذہبی یادگاروں کو دیکھنے کے لئے نہیں بلکہ ادبی، سیاسی، معاشرتی اور سوشل مقامات، پارک، تھیٹر اور ان سے تعلق رکھنے والے افراد سے ملنے کے ارادے سے کر رہا تھا۔ تاکہ میں اپنے اس پڑوسی ملک کے بارے میں بھی ایک عدد سفرنامہ لکھ سکوں۔ لہٰذا دل میں دنیا کی باتیں ہوں اور میں ظاہری طور پر عبادت کا ڈھونگ کرتا تو یہ دوسروں کے علاوہ اپنے آپ کو بھی دھوکا دینے کے مترادف ہوتا۔ اسی لئے جب میرا تمام گروپ نیشاپور میں امام زادہ محروق کی مسجد میں عبادت میں مصروف تھا تو اس وقت میں وہاں سے نکل کر عمرخیام کے مقبرہ کی جانب چل دیا تھا اور پھرفریدالدین عطار کے آستانے پر پہنچا تھا۔

مشہد اور قم کے علاوہ دیگر شہر دیکھنے اور ایرانی جہاز رانی سے تعلق رکھنے والے اپنے دوستوں سے ملنے کے لئے میں نے ایران میں مزید چند دن رہنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

مجھے جو اخبار ملا تھا وہ فارسی زبان میں تھا اور اس کا نام ”کیہان“ تھا۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ ایران جیسے ملک میں کوئی انگریزی اخبار شائع نہ ہوتا ہو۔ لہٰذا میں اپنی سیٹ سے اٹھ کر پیچھے کی جانب چل دیا جہاں ایک مختصر سے کچن میں وہی ایئرہوسٹس موجود تھی۔

"مجھے کوئی انگریزی اخبار مل سکتا ہے؟“ میں نے ایئرہوسٹس سے کہا۔

"آپ اپنی سیٹ پر تشریف رکھیے میں اخبار لے آتی ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔

جب جہاز نے ٹیک آف کیا اور اس کی پرواز ہموار ہوئی اور بیلٹ باندھنے والی بتی آف ہوگئی تب ایئرہوسٹس نے ایک انگریزی اخبار لاکر میرے حوالے کیا۔ اخبار کے صفحات سکھر سے شائع ہونے والے مقامی اخبارات کے سائز کے تھے۔ اس کی چھپائی ”عبرت“ اور ”سندھو“ جیسی تھی۔ تصاویر بھی پرانی ٹیکنالوجی کے مطابق تھیں اور اس کی چھپائی میں ایسی کچی سیاہی استعمال کی گئی تھی جو ہاتھوں کو لگ رہی تھی۔ اس اخبار کا نام ”تہران ٹائمز“ تھا اور لوح کے نیچے "Since 1979" تحریر تھا۔ یعنی وہ اخبار تقریباً تیس سال سے شائع ہو رہا تھا۔ سولہ صفحات کے اس اخبار کا فاؤنٹ اس قدر کھلا اور حروف قدرے موٹے تھے کہ ہمارے ملک کے اخبارات میں یہ تمام مواد صرف چار صفحات میں سما سکتا تھا۔ خبروں، صحافت اور مضامین کے لحاظ سے بھی اس اخبار میں ”دم“ نہیں تھا۔ آج کل کے دور میں ایسا اخبار پڑھنے یا نہ پڑھنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جس طرح ہماری حکومت نے ماضی کے قریب میں ایمرجنسی کا نفاذ کرتے ہی نجی چینلز پر پابندی عائد کردی تھی تو لوگوں نے ٹی وی دیکھنا ہی چھوڑ دیا تھا۔

جرنلزم کے معاملے میں ایران میں ہر اجنبی اور باہر سے آنے والے کو گھٹن کا احساس ضرور ہوتا ہوگا۔ مقامی لوگ شاید اس بات کے عادی ہوچکے ہیں کہ کسی صورت میں بھی حکومت پر تنقید نہیں کرنی ہے...یا شاید ایرانیوں کو اس بات کی پرواہ ہی نہیں ہے۔ انہیں اس کی فکر ہونی بھی نہیں چاہئے۔ کیونکہ ملک کے غریب طبقے کو مناسب قیمت میں روٹی دستیاب ہے، بسوں کے کرائے نہ ہونے کے برابر ہیں، روزگار اور تعلیم عام ہے، ملک میں انصاف اور امن امان کی صورت حال بہتر ہے۔ ایسا سکون اور لاءاینڈ آرڈر سعودی عرب حتیٰ کہ یورپ اور امریکا میں بھی نہیں ہے۔

اخبار کی قیمت دو ہزار ریال دیکھ کر مجھے شدید حیرت ہوئی تھی۔ ایک غیر معیاری اخبار کی اس قدر زیادہ

قیمت! میں نے سوچا کہ اتنا مہنگا اخبار کون خرید کر پڑھتا ہوگا؟ لیکن بعد میں ایران پہنچ کر وہاں کے سکے کے بارے میں معلوم ہوا تو میری حیرت رفع ہوگئی۔ ایرانی سکہ انڈونیشیا اور پولینڈ کی طرح ہے۔ دو ہزار ریال دو سو تومان کے برابر ہیں... ہمارا ایک روپیہ، پندرہ تومان کے برابر ہے۔اس حساب سے اخبار کی قیمت تیرہ روپے بنتی تھی۔ بہرحال میری رائے کے مطابق اس ”معیار“ کے اخبار کی قیمت تیرہ روپے بھی زیادہ ہے۔ اس قیمت میں تو ہمارے ہاں اتوار کے دن چھپنے والا ضخیم ”ڈان“ اخبار مل جاتا ہے۔

بہرحال ایسے اخبار کو پڑھنے کے لئے دس منٹ بھی کافی تھے۔ ایک خبر نے میری توجہ اپنی طرف ضرور مبذول کرالی تھی اور وہ خبر پاکستان کے متعلق تھی جسے پڑھ کر خوشی ہوئی کہ ایران کے ایک مصنف ”محمد بقائی مکان“ کو پاکستانی سفیر نے تہران میں تمغہ ٔ امتیاز دیا ہے۔ مذکورہ مصنف نے ہمارے ملک کے مفکر اور شاعر ڈاکٹر علامہ اقبال پر چوبیس ابواب پر مشتمل ایک کتاب لکھی ہے:

"The Retrospective of the thoughts & works of Iqbal"

علامہ اقبال کے ایک سو تیسویں یوم ولادت کے موقع پر ہانگ کانگ میں ”یونیورسٹی آف ہانگ کانگ“ کی جانب سے کانفرنس منعقد ہو رہی ہے اس کانفرنس میں ایرانی مصنف بقائی صاحب، ڈاکٹر اقبال کی شاعری پر مقالہ پڑھیں گے۔

ایڈیٹوریل صفحے پر جنرل پرویز مشرف کی تصویر کے ساتھ اس کی حکومت پر نجم سیٹھی کا ایک طویل تنقیدی مضمون شائع ہوا تھا۔ یہ مضمون ایک دن قبل امریکا کے ایک اخبار میں شائع ہوا تھا اور تہران ٹائمز نے اسے جوں کا توں چھاپ دیا تھا۔ نجم سیٹھی پاکستان سے شائع ہونے والے ایک انگریزی اخبار کے ایڈیٹر، مفکر اور دلیر صحافی ہیں۔ وہ حقائق نویسی کے جرم میں قید و بند کی صعوبتیں بھی جھیلتے رہے ہیں۔

گویا ایرانی اخبارات میں ملکی سربراہوں اور حکومت پر تنقید بھی شائع ہوتی ہے لیکن دوسرے ملک پر...! اس پر مجھے ایک پرانا لطیفہ یاد آیا:

"ایک امریکن نے روسی شخص سے کہا ”دیکھو ہمارے ملک میں کس قدر آزادی ہے۔ ہم چاہیں تو کسی بھی چوراہے پر کھڑے ہوکر امریکی صدر کو برا بھلا کہہ سکتے ہیں۔"

"یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔“ روسی نے جواب دیا۔ ”ہم بھی ماسکو کے کسی چوراہے پر کھڑے ہوکر امریکی صدر کو گالیاں دے سکتے ہیں۔"

میں کچھ دیر قبل سوچ رہا تھا کہ اپنے ایرانی دوستوں سے اس بات کا ذکر کروں گا کہ ہمارے ملک میں دوسری کوئی آزادی ہو یا نہ ہو ہمارا پریس ضرور آزاد ہے۔ ہمارے اخبارات ملک کے صدر پرویز مشرف کے خلاف بھی مضامین شائع کرسکتے ہیں... ممکن ہے وہ روس کی طرح جواب میں یہی کہیں کہ ان کے اخبار بھی پرویز مشرف کے خلاف لکھتے رہتے ہیں...

بہرحال اپنے ملک اور حکمرانوں کے خلاف اس قسم کے مضامین پڑھ کر دوسرے ملک کے لوگ ہمارے متعلق کس قسم کی رائے قائم کریں گے... ہم کیسے لوگ ہیں، ہمارا اخلاق اور کردار کیا ہے؟ ایران، ملائےشیا، کوریا اور سنگاپور جیسے ملک ترقی کرکے کس منزل پر پہنچ چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایران میں مقیم ایک پاکستانی مستان علی نے کہا تھا:

"ہم پاکستانی اپنا تعارف کراتے وقت گردن جھکا لیتے ہیں اور اس ملک کا باشندہ یہ بتاتے ہوئے کہ وہ ایرانی ہے، اس کا سر فخر سے بلند ہو جاتا ہے۔"

اخبار میں کئی ریسٹورنٹس کے اشتہار تھے جن کا تعلق یورپ اور امریکا سے ہے۔ حتیٰ کہ ولایتی سافٹ ڈرنکس اور آئس کریم کے اشتہار بھی تھے۔ میں نے سوچا کہ آخر ایران بھی ہماری طرح مسلمانوں کا ملک ہے اور دیکھا جائے تو کئی حوالوں سے یہ ہم سے زیادہ اسلامی ہے۔ یہاں بھی تو ولایتی چیزیں عام ہیں۔ ہمارے ہاں کوئی مسئلہ سر اٹھاتا ہے تو سب سے پہلے غیرملکی ریسٹورنٹ اور موبائل فون کے دفاتر کو نشانہ بنایا جاتا ہے۔ کوئی یہ نہیں سوچتا کہ نقصان اپنا ہی ہو رہا ہے۔

اخبار میں ایک اور بات نے بھی توجہ مبذول کرائی وہ یہ کہ کئی دفاتر اور اپارٹمنٹس کے اشتہارات میں کرائے اور فروخت کی قیمت ایرانی کرنسی کے بجائے امریکی ڈالرز میں تحریر تھی۔ اب سوچتا ہوں تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ایسا صرف اعداد کو مختصر کرنے کی غرض سے کیا جاتا ہوگا۔ مثلاً کسی مکان کی قیمت ایک لاکھ ڈالر ہے لیکن ایرانی کرنسی میں نوکروڑ پندرہ لاکھ ریال بنتی ہے۔ بہرحال ایران کی کرنسی کے حوالے سے میں ہر وقت الجھن ہی کا شکار رہا۔ چائے کا ایک کپ پینے کے لئے سوچنا پڑتا تھا کہ کتنی رقم ادا کرنی ہے۔

میرے خیال کے مطابق ایران دنیا کا واحد ملک ہے جہاں کے کرنسی نوٹ پر جو مالیت تحریر ہوتی ہے وہ بولی نہیں جاتی۔ اس کی Value بھی مختلف ہے۔ ایرانی نوٹ کا نام ریال ہے مگر کوئی بھی دکاندار ریال کے مطابق قیمت نہیں بلکہ تومان میں بتاتا ہے۔ اگر قیمت سنگل عدد میں بتائی جائے تو تب بھی اس کا مطلب تومان سمجھا جائے نہ کہ ریال۔ ایک تومان دس ریال کے برابر ہے۔ ایک سو تومان کی خریداری کرتے وقت آپ کو ایک ہزار ریال کا نوٹ دینا

پڑے گا۔ فرض کیجئے ہمارے ہاں روپے کے حساب سے نوٹ شمار کیے جاتے ہیں اگر پیسوں کے حساب سے قیمت بتائی جائے تو دکاندار ساٹھ روپے کے بجائے چھ ہزار پیسے طلب کریں گے۔ اس صورت میں ہمیں ہر چیز کی قیمت کو سو سے تقسیم کرنا پڑے گی۔ بالکل اسی طرح ایران میں ہر قیمت کو دس سے ضرب دے کر رقم ادا کرنی پڑتی ہے۔ میرا تجربہ ہے کہ بار بار اس بات کو ذہن نشین کرنے کے باوجود الجھن اپنی جگہ برقرار رہتی ہے لہٰذا اس سلسلے میں ایرانی حکومت کو ہی کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔

آخری ایام میں مشہد کے علی رضا بازار میں جاکر میں اپنے کیمرہ کی سم میں سے تصاویر سی ڈی پر منتقل کرا رہا تھا۔ فوٹوگرافر کی دکان پر ایک فقیر آیا اور دکاندار نے ۵۰۰ ریال کا نوٹ اسے دے دیا۔ فقیر نوٹ لے کر بے نیازی سے آگے بڑھ گیا۔ میں فوٹوگرافر کی "سخاوت" سے خاصا متاثر ہوا تھا... لیکن ہوٹل میں جاکر میں نے اس بات پر غور کیا تو مجھے فقیر سے متاثر ہونا پڑا۔ کیوں کہ اس نے "وسعت قلبی" کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہ نوٹ قبول کرلیا تھا۔ میں نے حساب لگایا تو معلوم ہوا کہ پانچ سو ریال کا نوٹ پچاس تومان کے برابر... اور ہمارے ہاں کے تین روپے کے برابر ہے۔ ہمارے ہاں ایسے سر پھرے فقیر بھی پائے جاتے ہیں جو پانچ روپے کا سکہ بھی قبول نہیں کرتے، وہ نوٹ مانگتے ہیں اور ہمارے ہاں کم سے کم مالیت کا نوٹ دس روپے کا ہے جو ڈیڑھ ہزار ریال برابر ہوا۔

جہاز کی لینڈنگ سے پہلے میری بائےں جانب بیٹھے ہوئے مسافر نے وہ اخبار مجھ سے مانگ لیا۔ وہ اس سے پہلے عبدالکریم مشتاق کی کتاب "صرف ایک راستہ" کا مطالعہ کرتا رہا تھا۔ وہ اخبار اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ بغداد جا رہا ہے جس کے لئے وہ تہران سے بس کے ذریعے کربلا پہنچے گا۔

کراچی ایئرپورٹ پر اپنی پرواز کے انتظار کے دوران میں نے کئی بوہری مرد اور خواتین دیکھیں۔ اس برادری کے لوگ اپنے مخصوص لباس سے پہچانے جاسکتے ہیں۔ میں سمجھا تھا کہ وہ سنگاپور یا ممباسا جا رہے ہیں۔ کیونکہ وہاں بوہری خاصی تعداد میں آباد ہیں۔ میں نے ایک شخص سے دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ وہ سب لوگ کربلا جارہے ہیں۔ وہ تمام لوگ بھی اسی جہاز میں سوار ہوئے تھے جس میں ہم سفر کر رہے تھے۔ ان لوگوں کا تعلق کراچی اور حیدرآباد سے تھا۔ بوہری ایک تجارت پیشہ اور امن پسند کمیونٹی ہے۔ مجھے یاد ہے جب میرا سنگاپور میں کچھ عرصہ رہنے کا اتفاق ہوا تھا تو کرائے پر مکان مہیا کرنے والے ایجنٹ نے مجھ سے پوچھا تھا:

"آپ کس علاقے میں رہنا پسند کریں گے؟"

"علاقہ کوئی بھی ہو۔" میں نے جواب دیا تھا "لیکن پڑوسی امن پسند ہوں۔"

"تو پھر آپ کے لئے میں بوہریوں کے علاقے میں مکان کا انتظام کرتا ہوں۔"

میں کراچی میں بھی ابتدائی چند برس نارتھ ناظم آباد بلاک سی میں بوہریوں اور آغاخانیوں کے علاقے میں رہا تھا۔ تحسین نامی بوہری چیف انجینئر کے ساتھ میں نے کئی سمندری سفر کیے تھے۔ انہوں نے بتایا تھا کہ فاطمی خلافت، امام المستنصر کے دور میں اسماعیلی شیعوں کی ایک کمیونٹی "بوہرا" وجود میں آئی تھی۔ بوہریوں میں جعفری بوہرا، داؤدی، سلیمانی، علوی اور دیگر مختلف سلسلے ہیں۔ لیکن اکثریت داؤدی بوہریوں کی ہے جو پاکستان اور انڈیا میں بھی آباد ہیں۔یہ لوگ تجارت پیشہ اور مالی طور پر مستحکم ہیں۔ بوہریوں کا خاص کاروبار ہارڈ ویئر اور رنگ فروخت کرنا ہے۔ خواہ ان کی دکانیں حیدرآباد، کراچی، احمدآباد، بڑودا میں ہوں یا سنگاپور، کوالالمپور، ممباسا اور کمپالا میں۔ بہرحال اب یہ لوگ مختلف فیلڈز میں بھی آرہے ہیں۔ ان میں سے ایک ہمارے چیف انجینئر تحسین ہیں۔ بوہری کمیونٹی کے موجودہ داعی محمد برہان الدین اور سابقہ رہنما طاہر سیف الدین نے تعلیم، ویلفیئر اور مذہب کے حوالے سے نمایاں خدمات انجام دیں ہیں۔ وہ ۱۹۱۵ءمیں پیدا ہوئے اور ۱۹۶۵ءمیں وفات پائی۔ برصغیر اور افریقہ کے کئی ملکوں میں ان کی بڑی عزت و تکریم کی جاتی تھی وہ ایک اسکالر، مصنف، شاعر اور Visionary کے طور پر جانے جاتے تھے۔

بوہریوں کی ایک اور بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ وہ مذہبی ہونے کے ساتھ ساتھ بڑی چاہت سے زیارات پر بھی جاتے ہیں۔ ہمارے چیف انجینئر تحسین کو لندن اور نیویارک کی سیر کرنے کا کچھ زیادہ شوق نہیں تھا۔ البتہ ہمارا جہاز بصرہ پہنچتا تھا تو وہاں کی مقدس مقامات کی زیارت کے لئے بڑے شوق سے جاتے تھے۔ آج کل عراق میں جنگی حالات ہونے کے سبب غیرملکیوں کو صرف کربلا اور نجف جانے کی اجازت ہے جبکہ عراق کے زیادہ تر شہروں میں زیارت کے لئے ہمارے ملک سے لوگ جاتے ہیں۔

کربلا وہ شہر ہے جہاں حق و باطل کی جنگ ہوئی تھی۔ بغداد سے تقریباً سو کلومیٹر جنوب میں دریائے عرفات کے کنارے پر کربلا شہر واقع ہے۔ یہیں پر حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا مزار ہے۔ ان کے قریب ہی حضرت علی اصغرؑ اور حضرت علی اکبرؑ استراحت فرما ہیں۔ وہاں سے کچھ ہی فاصلے پر حضرت عباسؑ علمبردار کا طلائی گنبد نظر آتا ہے۔

نجف میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مقبرہ ہے جو کربلا سے تقریباً اسّی کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ نجف سے آٹھ کلومیٹر کی دوری پر عراق کا شہر کوفہ ہے، جہاں کی مسجدِکوفہ میں حضرت علیؓ کو اس وقت شہید کیا گیا تھا جب آپؓ نماز پڑھ رہے تھے۔

یہ کہاں کے مولوی ہیں؟

پائلٹ کیبن سے نسوانی آواز میں جہاز کی لینڈنگ کا اعلان ہوا۔ پہلے فارسی اور آخر میں انگریزی زبان میں "ایئرلائن" کے جہاز پر سفر کرنے کا رسمی شکریہ ادا کرنے کے بعد مسافروں کے لئے ہدایات نشر ہوتی رہیں کہ جہاز کے مکمل طور پر رکنے اور سیڑھیاں لگنے تک مسافر اپنی سیٹوں پر بیٹھے رہیں اور بیلٹ بندھی رہے۔ یہ اعلان سنتے ہی مسافروں نے سیٹ بیلٹ کھولنے شروع کردیئے اور جہاز ابھی رن وے پر چلتا ہوا سیڑھیوں کی طرف بڑھ ہی رہا تھا کہ نصف سے زائد مسافر اپنی سیٹوں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ایئرہوسٹس ہاتھ کے اشاروں سے انہیں بیٹھے رہنے کی تلقین کرتی رہی لیکن وہ سیٹوں کے اوپر بنے ہوئے شیلف سے تھیلے اور بیگ وغیرہ اٹھا کر دروازے کی طرف بڑھنے لگے۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ اس جہاز میں سفر کرنے والے نصف سے زیادہ مسافر پاکستانی ہیں۔" وہ منظر دیکھ کر میں نے دل ہی دل میں سوچا تھا۔

دروازہ تقریباً دس منٹ کے بعد کھلا اور بھیڑ ہونے کے سبب بچے رونے لگے تھے۔ نہ جانے کیوں ہم پاکستانیوں میں یہ کلچر عام ہوچکا ہے کہ جہاز سے اترنے کے وقت اس قدر عجلت سے کام لیا جاتا ہے جیسے ٹوکیو کی سب وے ٹرین چھوٹنے والی ہو۔ ہمارے لوگ جہاز سے اترنے میں عموماً جلد بازی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور اس طرح گویا وہ پانچ سات منٹ پہلے باہر آجاتے ہیں لیکن اس کا فائدہ...؟ اس کے بعد ایئرپورٹ پر امیگریشن اور کسٹم کے چکروں میں ساری کسر نکل جاتی ہے اور ایئرپورٹ سے باہر پچاس روپے کی خاطر ٹیکسی ڈرائیور کے ساتھ "مذاکرات" میں آدھا گھنٹہ ضائع کردیتے ہیں۔

جہاز سے امیگریشن تک کا فاصلہ خاصا طویل تھا۔ میں اردگرد کا جائزہ لیتا آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا رہا۔ ایران کے اس نئے ایئرپورٹ "بین الملّی امام خمینی فرودگاہ" کی تعمیر اور دیواروں پر آویزاں تصاویر قابل دید ہیں۔ ان خوبصورت تصاویر میں ایران کے چند شہروں کے نظارے تھے۔ بعض تصاویر میں مختلف عمارات اور قبل از اسلام کے دور کی مورتیاں وغیرہ تھیں۔ گویا ایران نے اپنے ثقافتی ورثے کو قائم رکھا ہوا تھا۔ انہوں نے ہماری طرح یا افغانستان والوں کی طرح قدیم زمانے کی یادگاروں اور مجسموں کو تلف نہیں کیا ہے۔ ملائیشیا جیسے مسلم ملک میں بھی ہندوؤں کے مندر، دیوتاؤں کی مورتیاں، ملکہ وکٹوریا اور پرتگالی پنڈتوں کے مجسموں کو تاریخ کی حیثیت دے کر محفوظ رکھا گیا ہے۔ ہمارے ہاں توڑ پھوڑ کا کلچر نہ جانے کیوں فروغ پا رہا ہے۔

اس دوران چھ مولوی میرے سامنے سے گزرے۔ وہ تمام افراد عمر رسیدہ ہونے کے باوجود طویل قامت، مضبوط اور بھاری بھرکم جسم کے مالک تھے۔ ان کے چہروں پر لمبی اور سفید داڑھیاں اور سروں پر جالی والی ٹوپیاں تھیں۔ شاید وہ بھی اسی جہاز سے اترے تھے۔ ایک شخص نے میری طرف دیکھا تو میں نے فوراً اسے سلام کیا۔ اس نے سلام کا جواب دیا اور آگے بڑھ کر بڑی اپنائیت کے ساتھ مجھ سے مصافحہ کیا۔

جب میں امیگریشن ہال میں پہنچا تو قطاریں خاصی طویل ہو چکی تھیں۔ قطار میں سب سے آخر میں کھڑے ہونے سے بہتر تھا کہ وہاں رکھی ہوئی کرسیوں میں سے کسی ایک پر بیٹھ کر انتظار کیا جاتا۔ اردگرد رکھی ہوئی تقریباً تیس کرسیوں میں سے بعض پر بوہری مرد اور عورتیں براجمان تھیں۔ ایک جگہ وہی چھ مولوی حضرات بیٹھے دکھائی دیئے۔ وہ اپنے بیگ گود میں رکھے ہوئے تھے۔ ان میں غالباً قرآن شریف اور مذہبی کتابیں تھیں۔ وہ پچاس سے ساٹھ برس کی عمر کے تھے۔ وہ افغانیوں کی طرح سُرخ و سفید تھے لیکن قد اور جسمانی ساخت سے افغانی معلوم نہیں ہوتے تھے۔ ان کے سفید باریش چہروں پر عجیب نورانی کشش محسوس ہو رہی تھی۔ انہیں دیکھتے ہی ان سے ملنے اور ان سے باتیں کرنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ دل میں یہ تجسس بھی تھا کہ آخر یہ لوگ ہیں کون؟ وہ ایرانی ہرگز نہیں ہو سکتے تھے۔ مجھے ایران میں رہنے کا موقع تو نہیں ملا تھا لیکن دنیا کے مختلف ملکوں میں ایرانیوں سے میل جول رہا ہے۔ ان سے یہ اندازہ ضرور ہوا ہے کہ زیادہ تر ایرانیوں کی داڑھی قدرے چھوٹی اور مونچھیں بڑی ہوتی ہیں۔ ان کی داڑھیاں بڑی اور مونچھیں بالکل چھوٹی تھیں۔ ایرانی عام طور پر ٹوپی پہنے بغیر نظر آتے ہیں۔ وہ نماز بھی بغیر ٹوپی کے، یعنی ننگے سر پڑھتے ہیں۔ ان کے سروں پر جالی والی ٹوپی تھی جسے ملائیشیا میں "حاجی ٹوپی" کہتے ہیں۔ حج کرنے والے ملئی کچھ دن تک ایسی ہی ٹوپی پہن کر چلتے ہیں تاکہ اگر کسی کو معلوم نہیں ہے تو اسے خبر ہو جائے کہ وہ "حاجی صاحب" ہو گئے ہیں۔

ایرانی عموماً فربہ جسم کے مالک نہیں ہوتے۔ وہ اسمارٹ اور چلنے پھرنے میں تیز اور پھرتیلے ہوتے ہیں۔ ایران کے مولوی اور امام بھی ملازمت اور مشقت کا کام کرتے ہیں اور اسی وجہ سے صحت مند اور اسمارٹ ہوتے ہیں۔ لیکن یہ چھ افراد برصغیر کے ان مولویوں کی طرح فربہ دکھائی دے رہے تھے جو عموماً جسمانی مشقت کا کام نہیں کرتے۔ یہ بات ضرور تھی کہ انہیں "موٹا" یا "توندیل" نہیں کہا جاسکتا تھا۔ ان کی جسامت ایسی تھی جیسے ایک پٹھان، بنگالی سے اور کشمیری تامل اور مدراسی سے زیادہ صحت مند اور بھرے بھرے جسم کا نظر آتا ہے۔ وہ بھاری جسم کے باوجود اسمارٹ معلوم ہوتے تھے۔ اسی لئے وہ مجھ سے پہلے یہاں پہنچ گئے تھے۔

مجھے اپنی طرف متوجہ پاکر انہوں نے اپنے درمیان ایک کرسی خالی کی اور مجھے بیٹھنے کی دعوت دی۔ میں جیسے ہی ان کے قریب پہنچا تو وہ سب گویا میرے استقبال کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس عزت افزائی پر میں لمحے بھر کے لئے

ششدر رہ گیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے خیال آیا کہ یہ کوئی غیرمعمولی بات نہیں ہے کیوں کہ وہ خواہ پچاس ساٹھ برس عمر کے بزرگ تھے تو میں بھی سفید داڑھی والا ۶۵ برس کا ہوں۔اب میں تیس برس پہلے کے دور میں تو نہیں جی رہا جب ایسے ایئرپورٹ پر کوئی پیر مرد یا بزرگ خاتون مجھ سے کہتی تھیں "بیٹے! ذرا یہ بیگ رولر سے اٹھاکر ٹرالی پر رکھ دو"...

کسی بزرگ کو دیکھ کر میں ان کے لئے اپنی سیٹ خالی کردیتا تھا۔

بہرحال میں نے اردو میں ان سے پوچھا "کیا آپ افغانی ہیں؟"

"نہیں، نہیں۔"

"پاکستانی ہیں؟"

"جی نہیں۔"

"آپ کا تعلق ایران سے ہے؟" میں نے اس خیال سے یہ رائے قائم کی کہ غالباً یہ لوگ ایران کے کسی ایسے صوبے سے تعلق رکھتے ہیں جو ترکی یا ترکمانستان جیسی سابق روسی ریاست سے ملحق ہے۔

"جی نہیں۔" انہوں نے جواب دیا۔ "ہم دریائے آمو کے کنارے ازبکستان سے تعلق رکھتے ہیں اور آپ...؟"

میں انہیں کراچی کے ہی بارے میں بتانا چاہتا تھا کیوں کہ میرے خیال میں وہ لوگ زیادہ سے زیادہ پاکستان کے شہر کراچی سے واقف ہو سکتے تھے۔ ممکن ہے وہ ملائیشیا، انڈونیشیا یا کسی دوسرے ملک سے ہوتے ہوئے کراچی سے اس ایرانی جہاز میں سوار ہوئے ہوں گے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میری زبان سے حیدرآباد نکل گیا۔

"حیدرآباد میں رہائش کہاں ہے آپ کی؟" انہوں نے دریافت کیا اور میں سوچ میں پڑگیا کہ کیا وہ لوگ حیدرآباد شہر سے واقف ہیں یا جام شورو اور کوٹری کے بارے میں بھی جانتے ہیں؟ یہ ایسا ہی تھا جیسے میں ان سے پوچھتا کہ وہ دریائے آمو کے کنارے کس مقام اور کس شہر یا گاؤں میں رہتے ہیں۔ جواب میں وہ کسی بھی گاؤں کا نام بتاتے لیکن میں تو وہاں کے بارے میں بالکل نہیں جانتا تھا۔ ہم میں سے کتنے لوگ ایسے ہوں گے جو ازبکستان کے بڑے اور دارالحکومت شہر تاشقند کے بارے میں جانتے ہوں گے۔

"میں حیدرآباد سے کچھ فاصلے پر واقع ایک گاؤں سے تعلق رکھتا ہوں۔" آخرکار میں نے جواب دیا۔

"کون سا گاؤں جناب!" انہوں نے پوچھا۔ "مٹیاری، ٹنڈو آدم، نیو سعید آباد، شہداد پور...

"ہالا، ہالا..." میں نے جلدی سے جواب دیا۔ "میرا تعلق ہالا سے ہے۔"

"نیو ہالا یا پرانا ہالا...؟" ان میں سے ایک بزرگ نے فوراً پوچھا۔ میں حیران رہ گیا تھا۔ دریائے آمو کے یہ ازبکستانی ٹوٹی پھوٹی اردو بول رہے تھے لیکن ان کی جغرافیائی معلومات خاصی وسیع تھیں۔

"آپ نے اردو کہاں سے سیکھی ہے اور آپ ہالا سے کیسے واقف ہوئے؟ کیا آپ مویشیوں کے بیوپاری ہیں؟" میں نے ان سے پوچھا۔ کیونکہ ہر مہینے کے پہلے پیر کے دن ہالا میں مویشیوں کی بہت بڑی منڈی لگتی ہے جہاں سندھ، پنجاب اور بلوچستان سے سیکڑوں بیوپاری آتے ہیں اور اونٹ، گائے، بھینس، بکریوں وغیرہ کی خرید و فروخت کرتے ہیں۔

"نہیں بھائی! ہم مویشیوں کے بیوپاری نہیں ہیں۔" انہوں نے بتایا "دراصل کافی عرصہ پہلے ہم نے کراچی کے ایک مدرسے میں دینی تعلیم حاصل کی تھی۔ اب ہم تبلیغ کے لئے نکلے تھے اور ہمارے ساتھیوں کو نیو ہالا میں آکر ہم سے ملنا تھا۔"

"اب آپ زیارت کے لئے مشہد اور قم جارہے ہیں۔" میں نے پوچھا کیونکہ ہمارا اور دیگر زائرین کا ایران میں آمد کا یہی مقصد ہوتا ہے۔

"نہیں، اب ہم بائی روڈ اشک آباد، اس کے بعد سمرقند اور چند دن بخارا میں قیام کرنے کے بعد اپنے گاؤں روانہ ہو جائیں گے۔ ایران میں ہماری منزل زاہدان ہے۔"

تفصیلی تعارف کے بعد میں نے انہیں بتایا کہ میں سفر نامے تحریر کرتا ہوں۔

"ہم آپ کو دعوت دیتے ہیں کہ آپ کبھی ہمارے ہاں آئیں اور دریائے آمو کا نظارہ کریں۔" انہوں نے کہا۔ میں سوچ میں پڑ گیا۔ دریائے آمو وسطی ایشیا کے ملکوں میں خاص طور پر تاجکستان، ازبکستان اور ترکمانستان میں یقینا بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ دریا ۲۴۰۰ کلومیٹر طویل ہے اور تقریبا ۱۴۵۰ کلو میٹر تک آج بھی Navigable ہے... یعنی اس میں کشتیاں، لانچیں، بارجز اور چھوٹے جہاز چل سکتے ہیں۔ ہمارے سندھو دریا میں بھی ایک صدی پہلے دریائے آمو سے بھی بہتر نیوی گیشن ہوتی تھی۔ پرتگالی اور انگریزوں کے جہاز کیپ آف گڈ ہوپ سے چل کر ایٹلانٹک اور بحرِ ہند کا سفر طے کرکے صرف بحیرئہ عرب کی بندرگاہ کراچی میں لنگرانداز نہیں ہوتے تھے بلکہ کراچی سے آگے، سندھو ندی کے ذریعے ملتان تک پہنچ جاتے تھے۔ جس طرح ہم مسی سپی اور چائنگاؤ ندیوں میں داخل ہوکر امریکا کی بندرگاہ نیو آرلینس تک جا پہنچتے ہیں یا تھائی لینڈ کی بندرگاہ بینکاک میں لنگرانداز ہوتے ہیں۔ ہمارا یہ سندھو دریا اب محض بچوں کے کھیلنے کے لئے کرکٹ کا میدان بن گیا ہے اور تعمیرات کرنے والوں کے لئے ریت کا ذخیرہ ہے... ایک زمانہ وہ بھی تھا جب یہاں مست لہروں کے ساتھ پانی رواں رہتا تھا...

ان آذربائے جانی بزرگوں نے بالا سے آتے ہوئے جام شورو کے پُل سے دریائے سندھ کو ضرور دیکھا ہوگا۔ جہاں آج کل دھول اڑ رہی ہے... شاید اس لئے وہ مجھے اپنے ملک کا دریا دیکھنے کی دعوت دے رہے ہیں۔

"آپ نے دریائے آمو کے بارے میں سنا تو ضرور ہوگا؟"کافی دیر تک مجھے خاموش اور ذہنی طور پر غیر حاضر محسوس کرتے ہوئے ان میں سے ایک نے گویا مجھے بیدار کرنے کی کوشش کی۔

"جی ہاں۔" میں نے اثبات میں جواب دیا۔ "جب میں یورپ میں زیرِ تعلیم تھا تو کامرس ڈپارٹمنٹ کے افسر آذربائے جان سے تعلق رکھتے تھے اور وہ میرے کلاس میٹ بھی تھے۔ وہ بتاتے تھے کہ دریائے آمو وسط ایشیا کا سب سے بڑا دریا ہے جو دو دریاؤں "وخش" اور "پنج" کے سنگم سے شروع ہوتا ہے۔ جس طرح ہمارا دریائے سندھ، راوی، چناب، دریائے جہلم، ستلج وغیرہ کے ملاپ سے شروع ہوتا ہے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ مقامی لوگ دریائے آمو کو جیحون ندی بھی کہتے ہیں جو اُن چار ندیوں میں سے ایک کہی جاتی ہے جو جنت سے اس دھرتی پر اتاری گئیں۔

"اسلامی تاریخ نویسوں نے بھی اس ندی کو "جیحون ندی"کہا ہے۔ قدیم یونانی کتابوں میں اس ندی کو "آکشس" کہا گیا ہے۔" انہوں نے بتایا۔

بہرحال ایران کی قدیم سلطنت اور سکندراعظم کی فتوحات میں اس دریائے آمو کی ایک خاص اہمیت رہی ہے۔ موجودہ دور میں روسی اسی دریا کے ذریعے پیش قدمی کرکے پنج ندی سے افغانستان پر حملے اور فوجی آپریشن کرتے رہے ہیں۔ آج کل افغانستان میں امریکیوں کا دبدبہ ہے۔ انہوں نے افغانیوں کو خوش کرنے کے لئے اس دریا پر کثیر سرمایہ صرف کرکے "تاجک افغان دوستی پُل" تعمیر کیا ہے۔ یہ دریا ارل سمندر میں جاگرتا ہے جو ایک جھیل کی طرح ہے۔ دریائے آمو پر اریگیشن کے کام کی ابتدا ہونے کے بعد اب دریا کی انتہا تک بہت کم مقدار میں پانی پہنچتا ہے۔ اس کے نتیجے میں ارل سمندر روز بہ روز مختصر ہوتا جارہا ہے۔

ازبکستان کے ان بزرگوں نے بتایا تھا کہ وہ سُنی مسلمان ہیں اور دو دن کی تبلیغ کے لئے زاہدان جارہے تھے۔ جہاں وہ مکی مسجد میں ٹھہریں گے۔ ایران میں زیادہ تر شیعہ مسلمان رہتے ہیں لیکن ایران کے صوبے سیستان اور بلوچستان میں سُنی مسلمان بھی رہتے ہیں۔ ایرانی بلوچستان اور پاکستانی بلوچستان اس طرح ایک دوسرے کے قریب واقع ہیں جس طرح انڈین اور پاکستانی پنجاب کی سرحدیں ایک دوسرے سے ملتی ہیں۔

زاہدان ایرانی بلوچستان کا دارالحکومت ہے، جس طرح ہمارے بلوچستان کا دارالحکومت کوئٹہ ہے۔ ہمارے بلوچستان کے سرحدی شہر "کوہ تافتان" اور زاہدان کے درمیان اتنا فاصلہ حائل ہے جتنا کراچی سے نوری آباد! یعنی تقریباً ۱۰۰ کلو میٹر کی دوری ہے۔ میرے ہم عمر قاری زاہدان کو اس حوالے ضرور یاد کرتے ہوں گے کہ ایرانی انقلاب تک

یعنی شاہِ ایران کے دور میں ”زاہدان ریڈیو“ پاکستانیوں کا پسندیدہ ریڈیو اسٹیشن تھا۔ جہاں سے نشر ہونے والے فرمائشی پروگرام سے عموماً انڈین گانے سنائے جاتے تھے۔ ایران کے دیگر شہروں کی طرح زاہدان میں بھی جمعہ کی نماز ادا کرنے کے لئے جامع مسجد ہے۔ اس کے علاوہ سُنی مسلمانوں کے لئے ”مکی مسجد“ کے نام سے ایک وسیع مسجد ہے جس کی تعمیر اور میناروں کا انداز برِصغیر کے آکیٹیکچر سے ملتا جلتا ہے۔

زاہدان میں واقع مکی مسجد پورے ایران میں سنیوں کی سب سے بڑی مسجد ہے۔ امیگریشن کے سامنے بنی ہوئی قطار میں اب چند ہی لوگ باقی رہ گئے تھے۔ ہمارے گروپ کے گائیڈ محمد علی نے ادھر اُدھر پھیلے ہوئے اپنے لوگوں کو امیگریشن کے لئے قطار بنانے کی ہدایت کی۔ ہمارے ساتھ وہ ازبکستانی بزرگ بھی اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ آخر انہیں بھی ایران میں داخل ہونے کے لئے امیگریشن والوں سے ”انٹری“ کی مہر لگوانی تھی، اس کے بعد وہ ایران کے کسی بھی شہر میں جاسکتے تھے۔

ایرانی ویزا کی یہ اچھی بات ہے کہ ایران میں داخل ہونے کے بعد آپ کسی بھی شہر چلے جائیں، اس پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ تین مہینوں تک آپ جہاں جتنا وقت بھی رہنا چاہیں، رہ سکتے ہیں۔ کئی ملکوں میں ایسا نہیں ہے۔ جاپان اور انڈیا جیسے ملکوں میں آپ صرف تین یا چار صوبوں میں جاسکتے ہیں۔

رخصت ہونے سے پہلے میں نے ان تبلیغی جماعت کے بزرگوں سے ایک تصویر بنانے کی اجازت چاہی۔ لیکن وہ اس پر راضی نہیں ہوئے۔ جبکہ ایک بزرگ نے مسکراتے ہوئے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے گویا مجھے تصویر بنانے کی اجازت دی تھی۔ لیکن اپنے ساتھیوں کو انکار کرتے ہوئے دیکھ کر انہوں نے بھی فوٹو بنوانے کا ارادہ ملتوی کردیا۔

فارسی اور ہمارے ہاں بولی جانے والی زبانیں

تہران ایئرپورٹ پر امیگریشن والوں سے ایران میں داخلہ کی اجازت یعنی ویزا پر انٹری کی مہر ثبت کرانے میں کچھ زیادہ دقّت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ جس کاؤنٹر کے سامنے بنی ہوئی قطار میں، میں کھڑا تھا وہاں ایک امیگریشن افسر کے بجائے دو موجود تھیں۔ دوسری امیگریشن افسر غالباً زیرِ تربیت تھی۔ وہ دونوں باری باری میرے پاسپورٹ کو غور سے دیکھتی رہیں اور آپس میں بحث بھی کرتی رہیں۔ ہر گزرنے والے لمحے کے ساتھ میرے دل میں یہ خوف جاگزیں ہوتا رہا کہ ویزا ہونے کے باوجود شاید مجھے یہیں سے واپس لوٹا دیا جائے۔ اس کا ایک ہی سبب ہو سکتا تھا کہ میرے پاسپورٹ پر امریکا اور یورپی ملکوں کے ویزے دیکھ کر وہ غالباً یہ فیصلہ نہیں کر پارہی تھیں کہ مجھے ایران میں داخل ہونے کی اجازت دی جائے یا نہیں... وہ شاید یہی سوچ رہی تھیں کہ میں اپنی پوری زندگی یورپ اور امریکا کی گلیوں میں برباد کرنے کے بعد اب کبیر سنی میں یہاں کی مسجدوں میں ماتھا ٹیکنے کا ڈھونگ رچانے آیا ہوں...

آخرکار مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے خود کو مزید ذہنی عذاب میں مبتلا رکھنے کے بجائے ان سے انگریزی میں دریافت کیا "کوئی مسئلہ ہے؟"

"جی ہاں۔" اس نے شستہ انگریزی اور شائستہ لہجے میں جواب دیا۔

"کیا...؟" میں نے قدرے پریشان ہوکر جاننا چاہا۔

"آپ کے والد کا نام کیا ہے؟"

"اوہ، تو یہ مسئلہ ہے۔" میں نے سکون کی سانس لے کر دل ہی دل میں کہا اور انہیں اپنے والد صاحب کا نام بتایا "گل محمد۔"

"جی...؟" خاتون افسر میری طرف قدرے جھک کر بولی "دوبارہ کہئے۔"

میں نے قدرے بلند آواز میں اپنے والد صاحب کا نام دہرایا اور میں نے یہ نام انہیں کاغذ پر لکھ کر دینے کی بھی پیش کش کی۔

"نہیں سر! شکریہ۔ ہمارا مسئلہ حل ہوگیا۔" اس نے کہا اور کمپیوٹر کی جانب متوجہ ہوگئی۔ مختلف بٹن دباکر اس نے کمپیوٹر پر میرے نام کے ساتھ "گل محمد" لکھا۔

ازبکستان کے بزرگوں سے گفتگو میں محو ہو کر میرے ذہن سے یہ نکل گیا تھا کہ جہاز سے باہر آنے کے بعد میں نے دل ہی دل میں یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ امیگریشن کاؤنٹر پر جانے سے پہلے میں کسی کاغذ پر اپنا اور اپنے والد صاحب کا نام اردو میں لکھ کر کاؤنٹر پر دوں گا۔ کیوں کہ اردو اور فارسی رسم الخط ملتا جلتا ہے۔ انگریزی میں لکھے ہوئے "Altaf" سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ حرف "T" کا مطلب "ٹ" ہے یا "ط" اور "ت" ہے۔ کچھ عرصہ پہلے تک کمپیوٹر پر صرف انگریزی میں لکھا جاسکتا تھا اور ہر ملک کے ایئرپورٹ پر کمپیوٹر میں وہی فیڈ کیا جاتا تھا جو پاسپورٹ پر لکھا ہوتا تھا۔ لیکن اب کمپیوٹر کے ذریعے ہر زبان میںلکھا جاسکتا ہے۔ جس طرح عرب ملکوں میں عربی رسم الخط میں نام درج کیے جاتے ہیں، اسی طرح یہاں ایران میں بھی فارسی میں کیا جارہا تھا۔ جس طرح سندھی کے کئی الفاظ اردو میں شامل نہیں ہیں اسی طرح اردو کے کئی الفاظ انگریزی، عربی اور فارسی میں نہیں ہیں۔ ہمارا حرف "ش" ملئی اور انگریزی زبانوں میں نہیں پایا جاتا۔ اس کے لئے انگریزی میں "SH" اور ملئی میں "SY" لکھا جاتا ہے۔ اس طرح کہیں کہیں الجھن بھی پیش آتی ہے مثلاً "اسحاق" کو انگریزی میں اس طرح لکھا جاتا ہے "Ishaq"۔ انگریز اسے "اشاق" بھی پڑھ جاتے ہیں۔ "خ" کا تلفظ جرمن زبان میں ضرور ہے لیکن انگریز اس کے لئے "KH" لکھتے ہیں۔ "غ" کے لئے "GH" لکھا جاتا ہے۔

عربی زبان میں "گ" کا تلفظ موجود نہیں ہے۔ اس کی جگہ عربی میں "ق" لکھا جاتا ہے۔

میں کویت کی بندرگاہ پر کچھ عرصہ چیف انجینئر کے طور پر تعینات رہا تھا۔ ڈیوٹی کے دوران ربن کے ذریعے میرے نام کا جو ٹیگ میرے گلے میں آویزاں ہوتا تھا اس پر "گل محمد" کے بجائے عربی میں "قل محمد" لکھا ہوتا تھا۔ بعض کویتی عرب دوست مجھ سے پوچھتے تھے "یہ کیسا نام ہے؟"

ایران میں فارسی زبان کو رومن میں لکھنے کے لئے انہوں نے فارسی کے ان الفاظ کو جو انگریزی میں موجود نہیں ہیں، اس طرح ترتیب دیا ہے جس طرح ہم "خ" کے لئے "KH" استعمال کرتے ہیں۔ لیکن انہوں نے بعض الفاظ اس طرح Romanized کیے ہیں کہ ہم اردو اور سندھی پڑھنے والوں کو سمجھنے میں الجھن ہوتی ہے۔ ایران کے باشندے "ق" کے لئے "GH" استعمال کرتے ہیں۔ فارسی کا لفظ "قیامت" رومن انگریزی میں "Ghiamat" لکھا جاتا ہے۔

یورپ میں میرے ساتھ زیر تعلیم حسین قلی زادہ اپنا سر نیم "Ghalizada" لکھتا تھا۔ ہم اور دیگر یورپی دوست ٹیگ پر اس کا نام دیکھ کر اسے "غلیزادہ" کہتے تھے تو وہ بُرا مان جاتا تھا۔ ایران میں رہائش کے دوران ایسے کئی نام

سامنے آئے تھے جنہیں پڑھنے میں ہم سے غلطی ہو جاتی تھی۔ مثلاً "Enghlab Ave" (انقلاب ایو نیو) "Moghdam" (مقدم)، "Taghi" (تقی) وغیرہ۔

ہمارے ہاں مختلف کمپنیوں کی منرل واٹر بوتلیں فروخت ہوتی ہیں مثلاً نیسلے، آبِ حیات، AVA وغیرہ۔ ایران میں "عقیق" نامی منرل واٹر کی ایک کمپنی ہے۔ اس کمپنی کی بوتلوں پر ایک جانب فارسی میں "عقیق" اور دوسری جانب انگریزی الفابیٹ میں "Aghigh" لکھا ہوتا ہے۔ دوسرے ملک سے آنے والے لوگ اسے "عقیق" کے بجائے "عغیغ" پڑھتے ہیں۔ اسی طرح عبدالقیوم کو انگریزی میں Abdul Ghayoom یا محض Abdul Gayoom لکھا جاتا ہے۔ مالدیپ کے صدر کا نام بھی اسی طرح لکھا جاتا ہے۔

امیگریشن کی افسر بھی انگریزی میں لفظ "Gul" پڑھ کر الجھن کا شکار ہوگئی تھیں کہ یہ لفظ ان کی زبان فارسی کا ہے یا رومن انگریزی کا! اس صورت میں انہیں فارسی الفابیٹ والے کمپیوٹر پر "قل" لکھنا پڑے گا۔

بہر حال ایران کے مختلف شہروں میں رہائش کے دوران دکانوں کے فارسی نام، سڑکوں پر لگے ہوئے بورڈ اور اشتہارات پڑھ کر مجھے فارسی کے بعض الفاظ پر خاصی حیرت ہوئی۔ کیونکہ اس سے پہلے میں سمجھتا تھا کہ یہ الفاظ سندھی یا اردو کے ہیں۔

ہمارے ہاں دیہات میں مٹی اور بُھوسے کو ملاکر لپائی کے لئے جو گارا بنایا جاتا ہے اسے "گچ" کہتے ہیں۔ ایران میں آکر یہ معلوم ہوا کہ یہ لفظ "گچ" بھی فارسی زبان کا ہے۔ ہمارے شہر ہالا میں کاشی کے کام والی رنگین اینٹیں ہاتھ سے تیار کی جاتی ہیں جو زیادہ تر مساجد اور مقابر میں استعمال ہوتی ہیں۔ مشہد سے نیشاپور جاتے ہوئے معلوم ہوا کہ لفظ "کاشی" فارسی زبان کا لفظ ہے اور کاشی کا ہنر ایران ہی سے ہالا، نصرپور اور ملتان پہنچا تھا۔ ایران کی اس شاہراہ پر مجھے کاشی کے کئی کارخانے اور دکانیں نظر آئی تھیں۔ ایران میں ہونے والے کاشی کے کام کا کہیں مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔

ایران کے مختلف شہروں کی دکانوں پر لگے ہوئے فارسی زبان کے بورڈ پڑھ کر اپنائیت کا احساس ہوتا ہے۔ جیسے وہ اپنی ہی زبان ہو۔ ایسے ایسے الفاظ دیکھنے اور پڑھنے کو ملے جن کے بارے میں مجھے یہ غلط فہمی تھی کہ وہ سندھی اور اردو کے ہوں گے۔ لیکن یہاں آکر معلوم ہوا کہ یہ الفاظ فارسی زبان کے ہیں۔ کبھی کبھی مجھے یہ خیال آتا ہے کہ اگر ہماری زبانوں سے فارسی کے الفاظ نکال دیئے جائیں تو باقی رہ ہی کیا جائے گا؟

عربی ہماری مذہبی زبان ہے۔ انگریزوں نے ہماری سرزمین پر لگ بھگ دو سو برس تک حکومت کی تھی۔ ظاہر ہے ہماری زبان میں کئی عربی اور انگریزی کے الفاظ شامل ہوگئے ہیں۔ وہ الفاظ جنہیں ہم اپنا سمجھتے ہیں مثلاً بس،

لاری، بم، ڈیم، بائےکاٹ، گلاس وغیرہ۔ یہ تمام الفاظ انگریزی کے ہیں لیکن یہاں ایران میں آکر مجھے یہ احساس ہوا ہے کہ ہماری زبان میں شامل عربی اور انگریزی کے الفاظ تو برائے نام ہیں... وہ تو اصل میں فارسی سے بھری ہوئی ہے۔ ”خیابان، شاہراہ، بیابان، گلستان، جوہر، گلشن، اقبال، راہ، راہ نما، ہم عصر، پنجاب، تاج، شکار، سرکار، وزیر، زمیندار، سرشتہ دار، شاہین، شامیانہ، پنیر، پروانہ، سرمہ، سرخی، زن، زر...“ وغیرہ وغیرہ۔

یہ تمام الفاظ فارسی زبان کے ہیں جنہیں ہم اپنا سمجھ کر استعمال کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ تعلیمی الفاظ... ”تقسیم، ضرب، منفی، مثبت، اقلیت، اکثریت، درجہ ٔ حرارت، سرد، گرم، فہرست، نرخ، بازار، ایجاد، گرفتاری، شیشہ، آئینہ، ورزش، آزادی، زبان، مرغ، مغز...“ فارسی کے ہیں۔

جن الفاظ کو میں خالص سندھی کا حصہ سمجھتا تھا، وہ بھی فارسی کے ثابت ہوئے ہیں۔ مثلاً صندل، دیہہ، داروغہ، دُمبہ، چھبک (چابک)، چادر، چاکر وغیرہ۔ اس کے علاوہ چارپائی، تپائی، گل قند، جاگیر، بالکنی، کارکن، شاہ مات... (جو اکثر شطرنج کی بساط پر دی جاتی ہے) جمعدار، ناخدا، کوہِ نور، پاپوش (جوتا)، بزدل، فروش گاہ (دکان)، آرام گاہ وغیرہ وغیرہ۔

اسکول کے دنوں میں ایک مرتبہ ہمارے ماسٹر نے لفظ ”رومال“ کا مطلب سمجھاتے ہوئے بتایا تھا کہ یہ فارسی کے لفظ روء+ ملیدن سے نکلا ہے۔ یعنی چہرہ صاف کرنے والا... اور اب ایران کے ایک ہوٹل کے باتھ روم میں رکھے ہوئے ”دس مال "©_سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ وہ چھوٹے تولیے ہاتھ پونچھنے کے لئے ہیں۔ ”دست“ فارسی میں ”ہاتھ“ کو کہتے ہیں۔ ”دست“ کے حوالے سے کئی الفاظ ہمارے ہاں سندھی، اردو، سرائکی اور پنجابی زبانوں میں شامل ہیں۔ مثلاً دست شناس، دست کاری، دستیاب وغیرہ۔ بلوچی اور مکرانی زبان میں کہیں زیادہ فارسی کے الفاظ شامل ہیں۔ اردو، سندھی میں کم از کم ”آئےگا، جائےگا“ تو اپنے ہیں جبکہ مکرانی زبان میں یہ بھی فارسی کے ہیں ”اینگو بیا، بُرو“ وغیرہ۔

فارسی زبان کے چند الفاظ عجیب، بلکہ خاصے مضحکہ خیز معلوم ہوتے ہیں۔

پہلے دن مشہد کے ایک ریسٹورنٹ میں مینو بورڈ آویزاں دیکھا تھا۔ اس پر مغز، زبان، دل، مرغ وغیرہ پڑھ کر سمجھ میں آگیا تھا۔ کیونکہ ہمارے ہاں بھی یہ الفاظ مشترک ہیں۔ لیکن وہیں مجھے ایک لفظ عجیب محسوس ہوا اور میں سوچ میں پڑگیا تھا۔ وہ لفظ تھا ”تخم مرغ۔"

میں سوچتا ہی رہا کہ ”تُخم مرغ“ کیا ہو سکتا ہے۔ اپنے ہوٹل واپس آکر میں نے الحرمین کے سلمان سے اس کے بارے میں دریافت کیا تھا۔ اس نے بتایا کہ تُخم یعنی بیج، مطلب یہ کہ مرغی کا بیج!

"یہ مرغی کا بیج کیا ہوتا ہے؟" میں نے جاننا چاہا کیونکہ اس کی تشریح کردہ "مرغی کا بیج" ہنوز میری سمجھ سے بالا تھا۔

"انڈہ!" اس نے جواب دیا اور یہ سن کر مجھے بے اختیار ہنسی آئی تھی۔

اس قسم کے چند دلچسپ الفاظ میں نے اپنی ڈائری میں نوٹ کر لیے تھے۔

آبِ میوہ (فروٹ جوس)، آبِ معدنی (منرل واٹر)، بازار بزرگ مرکزی (سینٹرل گرانڈ مارکیٹ)۔ ہمارے ذہن میں لفظ "بزرگ" کا تصور مختلف ہے۔ ہم عمر رسیدہ افراد کو احتراماً بزرگ کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس لفظ سے ہمارے ذہن میں ایک درویش، مذہبی اور باریش شخصیت کا خاکہ اجاگر ہوتا ہے۔ بہرحال "بزرگ" لفظ فارسی زبان کا ہے اور اس کے معنی "بڑے" کے ہیں۔ "بازارِ بزرگ" کا مطلب ہے بڑا بازار۔ ایران کے باشندے اپنا غصہ نکالنے کے لئے امریکا کو "شیطانِ بزرگ" کہتے ہیں۔

نیشاپور جاتے ہوئے راستے میں ایک عمارت پر "بیمارستان رضوی" لکھا ہوا دیکھ کر میں سمجھ گیا تھا کہ وہ اسپتال کی عمارت ہو سکتی ہے۔ فارسی کا ایک لفظ ہے "صندلی چرخدار" یعنی ویل چیئر۔ کئی جگہ پر "حمل و سکت" کا بورڈ دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ میٹرنٹی کلینک ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ ہمارے ہاں بھی لفظ "حمل" خواتین کے حوالے سے مستعمل ہے۔ لیکن بعض ایسے مقامات پر لفظ حمل لکھا ہوا نظر آیا جو سابق معنی سے مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ ایک دن پانی کے ٹینکر پر "حمل آب" لکھا ہوا دیکھ کر مجھ پر اس لفظ کی معنی مزید واضح ہوگئی۔ لفظ حمل کے درست معنی ہے اٹھانا۔ حمل آب یعنی پانی اٹھانے والا ٹینکر۔

آب سے یاد آیا کہ فارسی کا یہ لفظ ہمارے ہاں عام استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً آب و ہوا۔ دو آب، پنجاب وغیرہ۔ لیکن جب میں طوس شہر میں فردوسی کے مقبرے پر پہنچا تھا تو مجھے سخت پیاس لگی تھی۔ اس وقت میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ فارسی زبان میں پانی کیسے طلب کروں۔ حالانکہ میں جب بھی کسی نئے ملک میں جاتا ہوں تو وہاں بولی جانے والی زبان کے دس بارہ الفاظ ضرور یاد کرلیتا ہوں۔ ان میں پانی اور ٹوائلٹ شامل ہیں۔ لیکن فارسی زبان سے ناواقف ہونے کے سبب اس دن میں خاصا پریشان رہا۔ ابتدائی دنوں میں مقامی لوگوں کو اپنا ماضی الضمیر سمجھانے میں مجھے خاصی مغز ماری کرنی پڑی تھی۔ بہرحال مجھے شدت کی پیاس لگی تھی اور میں اپنی ضرورت بتانے سے قاصر تھا۔ بعد میں جب مجھے معلوم ہوا تو مجھے خود پر غصہ آنے لگا۔ پھر ہنسی بھی آئی کہ یہ الفاظ ہمارے ہاں بولی جانے والی کئی زبانوں میں مشترک ہیں۔

یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہمارے ملک پر فارسی کا خاصا اثر ہے۔ ہمارے ملک کا نام فارسی زبان کا ہے۔ ہمارے قومی ترانے

میں نوے فی صد فارسی کے الفاظ ہیں۔ ہمارے ہاں بچیوں اور بچوں کے نام زیادہ تر فارسی سے لیے جاتے ہیں۔ نمونے کے طور پر یہاں ایرانی لڑکیوں کے نام تحریر کرتا ہوں جو ہمارے ہاں پاکستان میں بھی عام ہیں۔ ممکن ہے بعض لوگوں کو یہ معلوم ہی نہ ہو کہ یہ نام فارسی زبان کے ہیں۔ یہ نام مرتب کرنے میں میرے مرحوم دوست اسلام مصطفی کے بچوں نے میری مدد کی تھی۔

چٹاگانگ میں میرین انجینئرنگ کی تعلیم کے دوران اسلام مصطفی میرا کلاس میٹ تھا۔ ہم دونوں نے کئی جہازوں پر ساتھ ڈیوٹی انجام دی اور ساتھ ہی ترقی کرکے چیف انجینئر کے عہدے کو پہنچے تھے۔ اس نے ایک ایرانی خاتون فرخندہ سے شادی کرکے یہیں سکونت اختیار کرلی تھی۔ ۲۰۰۱ءمیں اسے ہارٹ اٹیک ہوا... اور ہمارا پیارا دوست ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہوگیا۔ اس کی تین بیٹیاں اور ایک بیٹا علی ہے۔ وہ تہران میں اپنی والدہ کے ساتھ رہتے ہیں۔ اسلام کی بیگم فرخندہ اور ان کے بچے روانی سے اردو بولتے ہیں۔ درج ذیل ایرانی ناموں کو مرتب کرنے میں اسلام مصطفی کی بیٹیوں، عالیہ، اور فائزہ نے میری مدد کی تھی۔

لڑکیوں کے چند نام جو فارسی زبان کے ہیں:

جہاں آرا، جہاں بانو، گل افشاں، گل اندام، گلبہار، گل بانو، گلبرگ، گلنار، گلناز، گل پری، دلشاد، گلشن، خاتون، خورشید، کوکب، درناز، فہمیہ، فرح، فرین، فرزانہ، غزل، غزالہ، غنچہ، فریال، یاسمین، زیبا، زینت، زرفشاں، مہ جبیں، ماہ لقا، ماہ راز، ماہ رُخ، مہناز، مہوش، نغمہ، نادیہ، ناہید، نازپری، نگار، نگین، نوشین، نوین، پری ناز، پری رو، پری چہرہ، ریحانہ، شیریں، شہناز، شہربانو، آفرین، افروز، عالیہ، الماس، انیتا، آرزو، ارمغان، آرمیتا، بنفشہ، اختر، دل آرا، دلکش، دلبند، دلبر، دلنواز، دلآرام، دلربا، دیبا، دینا، تہمینہ (رستم کی بیوی کا نام)، رخسانہ (سکندرِ اعظم کی ایرانی بیوی کا نام Rexona) ——۔

جعلی ویزاؤں کی وجہ سے پریشانیاں

تہران ایئرپورٹ پر امیگریشن کی طرح کسٹمکا مرحلہ بھی چند منٹوںمیں طے ہوگیا۔ ہمارا پاکستانی پاسپورٹ دیکھ کر ہمیں بے جا تنگ نہیں کیاگیا اور نہ ہی غیرضروری سوالات کیے گئے جبکہ دنیاکے بعض ہوائی اڈوں پر اس سے مختلف رویہ ہم پاکستانیوں کے لئے گویا معمول کی بات ہے۔ اس سلسلے میں کچھ قصور ہمارے لوگوں کا بھی ہے۔ سفر کے دوران ہمارے بعض پاکستانی بھائیوں کے سفری کاغذات، پاسپورٹ سے ویزا تک نامکمل اور ناقص ہونے کے سبب انہیں پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے... چنانچہ گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتے ہیں یعنی ہر پاکستانی کو شبہ کی نظر سے دیکھا جانے لگا۔

بیرونِ ملک کے متعلقہ اداروں سے تعلق رکھنے والے افراد عموماً خفگی کا اظہار کرتے ہیں کہ یہ کس قسم کے "ٹھگ" ان کے ملک میںداخل ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کے پاسپورٹ پر درج تاریخ ایکسپائر ہونے کے قریب ہوتی ہے یا پاسپورٹ یا ویزا جعلی ہوتا ہے۔ کسی کے پاسپورٹ پر تصویر تبدیل شدہ ہوتی ہے یا اسپیلنگ میں غلطی ہوتی ہے۔ کہیں تاریخ پیدائش کا اندراج درست نہیںہوتا۔ بہرحال آج کل ہمارے ملک کے پاسپورٹ Readable ہونے کے سبب ہمارے لوگ اب اس قسم کے فراڈ سے گریز کرنے لگے ہیں۔ کیونکہ الیکٹرانک مشین کے ذریعے سفر کرنے والوں کے فنگر پرنٹ اور دیگر ضروری Particulars وغیرہ نوٹ کیے جاتے ہیں۔ ملک چھوڑنے کے وقت خاص طور پر یہ دیکھا جاتا ہے کہ جانے والا شخص وہی ہے جو داخل ہوا تھا۔ ایسا نہ ہو کہ ان سفری دستاویزات پر کوئی اور نکل جائے۔

ایران کے لئے ویزا حاصل کرنا کچھ زیادہ مشکل کام نہیں ہے۔ ہزار یا بارہ سو روپے اور بلڈ رپورٹ جمع کرانے سے تین ماہ کا ویزا مل جاتا ہے۔ آج کل پاکستان میں سل بیماری کے پھیلنے کی افواہوں میں اضافے کے بعد ایرانی قونصل خانہ ایران جانے والے مسافروں سے پھیپھڑوںکا ایکسرے بھی طلب کرتا ہے۔ اس لئے ایران کے کئی شہروںمیں کلینک قائم کیے گئے ہیں۔ کراچی میں بھی عیسیٰ خان لیبارٹریز کی برانچیں کلفٹن، ڈیفنس، صدر، ناظم آباد اور دیگر علاقوں میں قائم ہیں۔

ویزا پر سنگل انٹری ہوتی ہے اور ڈبل بھی۔ جو لوگ ایران صرف زیارات کے لئے جاتے ہیں ان کے لئے سنگل ویزا کافی ہے۔ اس کے علاوہ عراق اور شام جانے والوں کے لئے ڈبل ویزا ضروری ہے کیونکہ وہ ایران پہنچ کر بس کے ذریعے کربلا

(عراق) جاتے ہیں جہاں سے واپسی پر دوبارہ انہیں ایران آنا پڑتا ہے۔ اس لئے ایسے افراد کے لئے ڈبل انٹری ضروری ہوتی ہے۔ بہرحال یہ کام آپ خود بھی کرسکتے ہیں۔

ایک دن میں ایران کے قونصلر سید مجددین افقا سے ملنے ایرانی قونصل خانے گیا تو قونصل خانے کے باہر مجھے کئی دیہاتی اور ان پڑھ بوڑھے بیٹھے ہوئے دکھائی دیئے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ ویزا کے حصول کے لئے وہ خود فارم پُر کرتے ہیں اور اگلے دن ویزا لے جاتے ہیں۔ مسٹر افقا کے ساتھ وہاں میری ملاقات ایک پاکستانی افسر عبدالہادی سے ہوئی تھی جو فارسی بھی روانی سے بول رہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ مطلوبہ ڈاکومنٹس مکمل ہوں تو ہم کسی کو ویزا دینے میں تاخیر نہیں کرتے۔

ہمارے گروپ کے لوگوں نے اپنے پاسپورٹ، بلڈ رپورٹ، ایکسرے اور ویزا کی فیس الحرمین ٹریول ایجنٹ کے حوالے کردی تھی۔ اس ایجنسی کے ذریعے گزشتہ تیس برس سے گروپ کی صورت میں زائرین مختلف ملکوں اور زیارات پر جاتے رہے ہیں۔ حج، عمرہ کے علاوہ ایران، عراق اور شام کی زیارات پر جانے والوں کے لئے الحرمین ٹریول ایجنسی کے مکمل انتظامات ہوتے ہیں جن میں رہائش، خوراک اور ٹرانسپورٹ کا بندوبست بھی شامل ہے۔ ایجنسی کا دفتر ایم اے جناح روڈ پر امام بارگاہ علی رضا کے بالکل سامنے ہے۔میرے شیعہ دوستوں کے ذریعے میرا رابطہ اس ایجنسی سے ہوا تھا۔

بہرحال ایران جانا کوئی مشکل کام نہیں ہے اور نہ ہی اس کے لئے کوئی غیرمعمولی جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ ایران کے سفر کے لئے اخراجات بھی مناسب ہیں... لیکن افسوس کہ اس نیک کام میں بھی ہمارے اپنے کچھ لوگ فراڈ کرنے سے باز نہیں آتے۔ سادہ طبع لوگوں سے پیسے بٹور کر انہیں جعلی ویزا فراہم کرتے ہیں۔ بعد میں وہ بے چارے پردیس میں یا بارڈر پر دربدر ہو جاتے ہیں۔ اس قسم کے فراڈ عموماً بائی روڈ جانے والوں کے ساتھ بلوچستان کے بارڈر پر ہوتے ہیں۔

قم میں میری ملاقات دو شیعہ علماءمولانا غلام شبیر وڈھو اور زوار خان محمد چانڈیو سے ہوئی تھی۔ وہ اپنے گاؤں کے تیس افراد کو ساتھ لے کر ایران اور عراق کی زیارات پر آئے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ بائی روڈ یعنی کوئٹہ کے راستے یہاں پہنچے تھے۔

"ہم سے ایک ایجنٹ نے رقم لے کر کہا تھا کہ وہ اسلام آباد سے ایرانی ویزا لگوا کر دے گا۔“ مولانا شبیر نے بتایا۔ یہ سن کر ہمارے گروپ کے ایک شخص نے کہا۔

"پہلی بات یہ کہ اسلام آباد سے ویزا نہیں لگتا۔ دوسری بات یہ کہ آپ نے جس ایجنٹ کا نام بتایا ہے وہ اس قسم کے فراڈ کرنے میں خاصا بدنام ہے۔ وہ دو نمبر کے کام کرکے اکثر لوگوں کو مصیبت میں ڈال دیتا ہے۔"

"ہمیں تو معلوم ہی نہیں تھا..." مولانا شبیر نے گہرا سانس لے کر کہا۔ "ہم تو اس وقت پریشان ہوگئے تھے جب ہم پاکستان کے سرحدی شہر کوہ تافتان سے ایرانی سرحدی شہر میرجاوا کی طرف روانہ ہو رہے تھے۔ ایرانی امیگریشن پولیس نے ہمیں وہیں روک لیا تھا۔ آپ خود سوچئے... ہمارے قافلے میں زیادہ تعداد بزرگ مرد اور خواتین کی تھی۔ ہم سب لوگ دادو ضلع سے سفر کرکے کوئٹہ پہنچے تھے۔ وہاں سے بلوچستان کی ٹوٹی پھوٹی سڑک پر رات بھر سفر کرکے ایرانی بارڈر پر پہنچے تھے... وہاں سے ہمیں واپس روانہ کیا جارہا تھا۔"

مولانا غلام شبیر نے مزید بتایا "آخرکار ہماری دعائیں بارآور ہوئیں، اس کے علاوہ ایران میں مجھے جانا بھی جاتا تھا کیونکہ یہاں میں نے کئی برس تک درس و تدریس کی خدمات انجام دی ہیں... ہمیں ایران میں داخلے کی اجازت دے دی گئی۔ دوسری صورت میں گاؤں میں میری کیا عزت رہ جاتی؟ اسی طرح ایجنٹ معصوم لوگوں کو بے وقوف بناکر انہیں لوٹ لیتے ہیں۔"

اس وقت الحرمین کے عابد جعفری میرے ساتھ تھے۔ انہوں نے مذکورہ ایجنٹ کا نام لیتے ہوئے بتایا کہ وہ اس معاملے میں خاصا "مشہور" ہے۔ اس کا طریقہ ٔ واردات یہ ہے کہ وہ سندھ اور پنجاب کے دیہی علاقوں میں چکراتا رہتا ہے۔ وہاں کے لوگوں سے فی کس سوا لاکھ روپے وصول کرکے انہیں حج کرانے کے بجائے یہاں ایران لے آتا ہے۔

"انہیں مشہد میں امام رضاؑ کے روضے پر لاکر کہتا ہے کہ آپ مکہ شریف پہنچ چکے ہیں... پھر انہیں قم میں حضرت معصومہ کی درگاہ پر لے جاتا ہے اور انہیں بتاتا ہے کہ یہ مسجدِ نبوی ہے، استغفراللہ...! ہمارے درمیان ایسے ظالم لوگ بھی پائے جاتے ہیں۔ غریبوں کے ساتھ دھوکا تو کرتے ہی ہیں اس کے علاوہ اس قسم کا جھوٹ بھی بولتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی تشہیر ہونی چاہئے تاکہ عوام ایسے ٹھگوں سے ہوشیار رہیں۔" عابد نے کہا تھا۔

یہاں میں یہ بھی بتاتا چلوں کہ کوہِ تافتان کوئٹہ سے ۶۳۰ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ راستے میں نوشکی، احمدوال، پاڈاگ روڈ، دالبندین، یکمچ اور نوکنڈی جیسے چھوٹے گاؤں ہیں۔ سڑک اس قدر خراب ہے کہ یہ فاصلہ ۲۴ گھنٹوں میں طے ہوتا ہے۔ پاکستان کے بارڈر سے گزرنے کے بعد تقریباً تین چار کلومیٹر کے فاصلے پر ایران کا پہلا شہر "میرجاوا" واقع ہے۔ وہاں سے تقریباً ۱۰۰ کلومیٹر کی مسافت کے بعد ایران کے ایک بڑے شہر اور ایرانی صوبے بلوچستان کے دارالحکومت زاہدان پہنچا جاسکتا ہے۔ پاکستان کے مقابلے میں ایران کی سڑکیں اس قدر کشادہ، پختہ اور پُرامن ہیں کہ یہ فاصلہ، یعنی ۱۰۰ کلومیٹر صرف ایک گھنٹے میں طے ہو جاتا ہے۔ جبکہ ہمارے علاقے نوکنڈی سے کوہ تافتان تک کا ۱۲۰ میل کا راستہ طے کرنے میں دس گھنٹے سے زیادہ صرف ہو جاتے ہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اس مسئلے کے باوجود بائی روڈ ایران آنے میں انتہائی کم اخراجات ہوتے ہیں۔ اس سفر کے مقابلے میں ہوائی جہاز کا سفر انتہائی مہنگا ثابت ہوتا ہے۔ ایران میں رہائش اور کھانے پینے کا سامان بھی زیادہ مہنگا نہیں ہے۔ خاص طور پر عرب ملکوں کے مقابلے

میں! بعض چیزیں تو ہمارے ہاں سے بھی سستی ہیں۔ خواہ انڈیا اور پاکستان کے مقابلے میں بعض اشیاءسستی نہ بھی ہوں تب بھی معیاری، صاف ستھری اور ہائی جینک ضرور ہیں۔ ایرانی شہروں کے نلکوں کا پانی بھی پینے کے قابل ہے... اور کیا چاہئے!

ہمارے ہاں نصف سے زائد بیماریاں آلودہ پانی پینے اور بیمار جانوروں کا گوشت کھانے سے پیدا ہوتی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ایرانی ہم سے زیادہ صحت مند اور تندرست نظر آتے ہیں۔ کم کھانے اور زیادہ پیدل چلنے کی وجہ سے یہاں کے باشندے اپنے پڑوسی عرب ملکوں کے باشندوں سے زیادہ اسمارٹ ہیں۔ ایرانی حکومت نے اپنے عوام کے لئے ٹرانسپورٹ کی جو سہولت فراہم کی ہے اس کی تعریف نہ کرنا بُخل اور بددیانتی ہوگی۔ ایران کے بڑے شہروں مثلاً قم، اصفہان، تبریز اور شیراز وغیرہ میں بسوں کا کرایہ برائے نام ہے۔ میں فرصت کے وقت بس میں سوار ہوجاتا تھا اور اس طرح گویا پورے شہر کی سیر کرنا میرا خاص مشغلہ تھا۔ ایران میں اگر آپ کو راستوں کی معلومات ہوں تو چار سیٹوں والی ٹیکسی بھی آپ کو مہنگی محسوس نہیں ہوگی۔ اس بارے میں مجھے بھی پہلی بار ایک افریقی طالب علم نے بتایا تھا۔ وہ خمینی مدرسہ قم میں زیر تعلیم تھا۔ جب میں ایران کے اس بڑے اور بین الاقوامی اہمیت کے حامل مدرسے کو دیکھنے اور وہاں پہنچنے کے لئے بس اسٹاپ پر کھڑا تھا تو وہاں میری ملاقات کانگو سے تعلق رکھنے والے طالب علم ذوالعقد سے ہوئی تھی جو اسی مدرسے کے ہاسٹل میں رہتا تھا۔ وہ مجھے ٹیکسی میں بٹھا کر قم کے مرکزی بازار تک لایا تھا۔ وہ اچھی انگریزی بول سکتا تھا۔ اسی نے مجھے وہاں کی ٹیکسیوں کے سسٹم کے بارے میں بتایا تھا۔ قم میں واقع اس مشہور "امام خمینی مدرسہ" کے بارے میں آئندہ صفحات پر تحریر کروں گا جہاں کئی ملکوں کے علما اور طلبا سے میری ملاقات ہوئی تھی۔

گزشتہ صفحے پر ذکر کیے ہوئے مولانا غلام شبیر ودھو یہاں کے قابل اور تعلیم یافتہ لوگوں میں سے ایک ہیں۔ وہ مولانا عبیداللہ کے فرزند ہیں اور پاکستان میں ان کی رہائش شہدادکوٹ تحصیل کے "چاکیانی" قصبے میں ہے۔مولانا صاحب یکم مارچ ۱۹۶۱ءکو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گوٹھ میرو خان میں حاصل کی۔ مولانا اختر حسین چانڈیو ان کے ابتدائی استادوں میں سے ایک ہیں۔ جامع المقدمات کے بعد حصولِ علم کے لئے کوئٹہ چلے گئے جہاں جامع امام صادق علمدار روڈ پر واقع ایک مدرسے میں زیر تعلیم رہے۔ اس کے بعد ایران چلے آئے اور وہاں "حوزہ علمیہ قم" میں آیت اللہ سید محمد مفتی الشیعہ اردبیلی سے یہ درس حاصل کیا:

نہج البلاغہ، صحیفہ سجادیہ، کتب اربعہ یعنی اصول کافی، من لایحضرہ الفقیہ، الاستبصار، تہذیب اور علوم تاریخ۔

مولانا غلام شبیر نے بتایا کہ انہوں نے قم میں ان مضامین میں پہلی پوزیشن حاصل کی تھی۔ اس کے بعد سندھ یونیورسٹی سے "امام زمانہ مہدیؑ موعود" میں پی ایچ ڈی کی۔ وہ لیکچر دینے کے لئے کئی مرتبہ شام اور کربلا

آچکے ہیں۔ انہیں فارسی پر قابل رشک عبور حاصل تھا۔

ان کے ساتھ ضلع دادو کے گاؤں ”ماڈو“ سے تعلق رکھنے والے زوار فیض محمد چانڈیو کے فرزند زوار خان محمد چانڈیو تھے۔ ان کے دادا زوار رئیس جان محمد چانڈیو (مرحوم) شیعوں کے بڑے عالم تھے۔ زوار خان محمد چانڈیو نے ڈگری کالج خیرپور ناتھن شاہ سے ایم اے کیا اور سندھ یونیورسٹی سے MEd حاصل کیا۔

تہران ایئرپورٹ اور سویٹروں کی گمشدگی؟

تہران ایئرپورٹ پر امیگریشن سے جلد فارغ ہوکر میں باہر آکر کھڑا ہوگیا۔ سامان کی صورت میں میرے ساتھ صرف ایک چھوٹا بیگ تھا، جسے میں نے جہاز میں اپنے ساتھ رکھا تھا اور جہاز سے اترنے کے وقت خود ہی اٹھا لیا تھا۔ میرے گروپ کے دیگر ساتھی، خاص طور پر وہ لوگ جو اپنے ساتھ بہت زیادہ سامان لائے تھے، اپنے بیگوں کا انتظار کرنے لگے۔

گروپ میں سفر کرنے کے جہاں چند فائدے ہیں وہاں یہ نقصان بھی ہے کہ سب کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح خاصا وقت ضائع ہوتا ہے۔ کبھی کبھی کسی ایک شخص کی سستی کے سبب "کنیکٹنگ فلائٹ" مس ہونے کا اندیشہ رہتا ہے۔ جس طرح اب ہمیں تین گھنٹے کے اندر مشہد جانے کے لئے مقامی پرواز میں سوار ہونے کے لئے وقت پر پہنچنا ضروری تھا۔

پاکستان سے آنے والی ایئرایران کی یہ پہلی فلائٹ تھی جس نے تہران کے نئے ایئرپورٹ "بین الملّی امام خمینی فرودگاہ" پر لینڈ کیا۔ اس سے قبل کراچی سے آنے والے تمام جہاز تہران کے پرانے ہوائی اڈے "مہرآباد" ایئرپورٹ پر اترتے تھے۔ مہرآباد ایئرپورٹ تہران شہر کے قریب ہے اور یہ نیا ایئرپورٹ شہر سے تقریباً ۳۵ کلومیٹر دور، تہران قم ہائی وے کے قریب واقع ہے۔ اندرونِ ملک کے لئے جانے والی پروازیں اب بھی پرانے ایئرپورٹ سے جاتی ہیں اور آنے والی بھی وہیں لینڈ کرتی ہیں۔ اگر ہمارا جہاز بھی مہرآباد ایئرپورٹ پر لینڈ کرتا تو کوئی مسئلہ نہ ہوتا۔ کیونکہ وہیں سامان کو ٹرالیوں پر لاد کر اس گیٹ تک پیدل چلتے ہوئے پہنچ جاتے جہاں سے مشہد کے لئے جہاز کو پرواز کرنا تھا... لیکن اب ہم اس گیٹ سے ۳۵ کلومیٹر دور کھڑے تھے۔ ہمیں وہ فاصلہ بسوں یا ٹیکسیوں کے ذریعے طے کرنا تھا اور اس کے لئے ہمیں تہران شہر کے کچھ حصے سے بھی گزرنا تھا۔ میں یہ بھی بتاتا چلوں کہ تہران کی سڑکوں پر ٹریفک کا اژدہام دیکھ کر کراچی کی سڑکیں اور وہاں کا ٹریفک یاد آتا ہے۔

بہرحال ہمارے جہاز سے اترنے والے تمام مسافر بسوں اور ٹیکسیوں میں سوار ہوکر تہران اور دیگر شہروں کی جانب روانہ ہوچکے تھے۔ ہم تیس افراد کے گروپ کے لئے ایسی بس کی ضرورت تھی جس کی چھت پر یا نیچے سامان رکھنے کی جگہ ہو۔ ایئرپورٹ سے تمام لوگوں کے باہر آجانے کے بعد ہمارے گروپ کے راہنما محمد علی کو ہی اس سلسلے میں انتظام کرنا تھا۔ وقت گزارنے کے لئے میں اس نئے ایئرپورٹ کی تزئین و آرائش کا جائزہ لیتا رہا۔ پھر میں باہر

کا نظارہ کرنے لگا۔ دور دور تک ہائی وے پر مرکری بلب روشن نظر آرہے تھے۔

میرے سامنے چند لوگ ایک ٹیکسی ڈرائیور کے ساتھ بحث کر رہے تھے۔ بعد میں محمدعلی نے ان کے بارے میں بتایا کہ وہ خیرپور سندھ کے رہائشی تھے۔ وہ فارسی بول رہے تھے لیکن گفتگو کے دوران وہ فارسی کے ساتھ سندھی الفاظ بھی بول جاتے تھے۔ آخرکار وہ کرایہ طے کرکے ٹیکسی میں بیٹھ گئے اور کہیں روانہ ہوگئے۔ ان کے پُراعتماد رویے اور لہجے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اس سے پہلے بھی ایران آتے رہے ہیں۔ اس دوران یورپ سے آنے والی ایک پرواز بھی وہاں لینڈ کرچکی تھی۔ اس فلائٹ سے آنے والے ایک نوجوان مسافرکو رسیو کرنے کے لئے ایئرپورٹ پر کئی لوگ موجود تھے۔ یقینا وہ سب لوگ اس نوجوان کے عزیز و اقارب اور دوست احباب تھے۔ چند لوگوں کے پاس مووی کیمرے بھی تھے۔ ایئرپورٹ سے باہر آتے ہی نوجوان کو پھولوں کے ہار پہنائے گئے اور وہاں موجود تمام افراد کو ایک ایک پھول پیش کیا گیا۔

یورپ سے آنے والا وہ طویل قامت اور اسمارٹ نوجوان بغیر ٹائی کے سوٹ میں ملبوس تھا۔ میں نے دیکھا ہے کہ ایرانی باشندے ولایت میں بھی ٹائی نہیں باندھتے۔ سویڈن کی یونیورسٹی میں تقریباً بیس ایرانی طالبِ علم میرے ساتھ زیرِ تعلیم تھے۔ میں نے دو برسوں کے دوران انہیں کبھی ٹائی کے ساتھ نہیں دیکھا۔ یونیورسٹی کے سالانہ ڈنر میں بھی وہ بغیر ٹائی کے شرکت کرتے تھے۔

بہرحال یورپ سے آنے والے اس نوجوان کو میں نے ایران کی اہم شخصیت سمجھا اور قریب کھڑے ہوئے ایک شخص کو اپنا کیمرہ دے کر درخواست کی کہ وہ ہمارا ایک فوٹو بنائے۔ پھر میں نے اسی نوجوان سے اس کے بارے میں پوچھا...لیکن انگریزی اس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی اور اس کی بولی جانے والی فارسی میرے سمجھ سے بالا تھی۔ میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ آخر وہ ہے کون؟ وہ فٹ بال یا ہاکی کا کھلاڑی ہے یا اس کا تعلق کسی اور Sport سے ہے۔ پھر مختلف لوگوں کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ نوجوان کوئی قومی کھلاڑی نہیں بلکہ جرمنی سے کیمسٹری کی اعلیٰ تعلیم میں نمایاں پوزیشن حاصل کرکے لوٹا ہے۔ اس پر ایرانی فخر محسوس کر رہے ہیں۔ اس نوجوان کے مہکتے چہرے پر کھیلنے والی کامرانی کی مسکراہٹ دیکھنے کے قابل تھی۔ اس کے علاوہ وہ منظر بھی قابل دید تھا جب وہ نوجوان بڑے والہانہ انداز میں اپنے والدین سے ملا، سچی بات تو یہ ہے کہ وہ منظر دیکھ کر نوجوان کے والدین کے ساتھ ساتھ میری آنکھیں بھی نم ہوگئیں۔

سویڈن میں تعلیم کے دوران میں نے دیکھا کہ ایرانی طالب علم بہت زیادہ محنت کرتے تھے۔ وہ کبھی بھی یونیورسٹی کی کلاس مِس نہیں کرتے تھے اور عموماً آگے کی سیٹوں پر بیٹھتے تھے۔ ایرانی سفارت خانے کے افسر، دورے پر آنے والے ایرانی سیاست داں اور وزیر وقتاً فوقتاً ان سے ملنے آتے تھے۔ ملاقات کے دوران وہ انہیں محنت کرنے اور اعلیٰ پوزیشن

حاصل کرنے کی تلقین کرتے تھے۔ دنیا کے دیگر ملکوں سے تعلق رکھنے والے طلبا ان کا اخلاق و کردار دیکھ کر ایران سے خاصے متاثر ہوتے تھے۔ حالانکہ مغربی پریس ہر وقت ایران کے خلاف زہر اگلتا رہتا ہے اور اس کے خلاف پروپیگنڈہ کرتا رہتا ہے کہ وہ لوگ جاہل اور غیر ترقی یافتہ ہیں جبکہ حقیقت کچھ اور ہی تصویر دکھاتی ہے۔

ائیرپورٹ کو فارسی زبان میں یقینا "فرودگاہ" کہتے ہوں گے۔ کیونکہ تہران کے اس نئے ایئرپورٹ پر انگریزی میں "امام خمینی انٹرنیشنل ایئرپورٹ" کے ساتھ فارسی میں "بین المللی امام خمینی فرودگاہ" لکھا نظر آ رہا تھا۔ یہ نیا ایئرپورٹ تہران شہر سے تقریباً ۳۵ کلومیٹر کے فاصلے پر مشرق میں ہے اور پرانا یعنی مہر آباد ائیرپورٹ شہر کے قریب مغرب میں ہے۔

شہنشاہِ ایران کے دور میں اس نئے ایئرپورٹ کی ضرورت کو محسوس کیا گیا اور پہلے اس کا نام احمد آباد ایئرپورٹ تجویز کیا گیا تھا۔ لیکن بعد میں، یعنی ۱۹۷۹ء میں آنے والے ایرانی انقلاب کے بانی آیت اللہ روح اللہ خمینی کا نام اس ایئرپورٹ کو دیا گیا۔ پہلے اس ائیرپورٹ کی تعمیر کا ٹھیکہ ایک غیر ملکی کمپنی کو دیا گیا تھا لیکن انقلاب کے بعد فیصلہ کیا گیا کہ اس ایئرپورٹ کی تعمیر اپنے ہی لوگوں سے کرائی جائے۔ اس ایئرپورٹ کی تعمیر میں کئی رکاوٹیں پیش آتی رہیں۔ ایران اور عراق کے درمیان ہونے والی آٹھ سالہ جنگ کے دوران ایئرپورٹ پر ہونے والا تعمیراتی کام تسلسل سے جاری نہیں رہ سکا تھا۔ بہرحال ڈیڑھ سال قبل ایئرپورٹ آپریشنل پوزیشن میں آ چکا تھا لیکن ایئرپورٹ پر جہازوں کے لینڈ کرنے کا سلسلہ اسی سال سے شروع ہوا۔ کراچی سے آنے والی پہلی پرواز ہماری تھی جسے یہاں لینڈ کرنے کی اجازت ملی تھی۔ اس سے ہم پاکستانیوں کو فائدے کے بجائے نقصان ہی ہوا تھا کیونکہ ہمیں تہران ایئرپورٹ پر آنے کے بعد مشہد جانا تھا۔ اب ہمیں اور دوسرے تمام مسافروں کو ٹیکسیوں اور بسوں کا کرایہ ادا کر کے پرانے مہر آباد ایئرپورٹ جانا تھا۔

ایران ایئر کے جہازوں کی ایک خصوصیت بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں... وہ یہ کہ ایئر ایران کے کسی بھی جہاز پر شراب سرو نہیں کی جاتی۔ ایران کے تمام جہازوں پر حلال کھانا پیش کیا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی ایران کے تمام جہازوں پر سگریٹ نوشی کی اجازت نہیں ہے۔ بین الاقوامی پروازوں پر نماز کے لئے جگہ مخصوص ہے۔ جہازوں کی "ایگزیکٹو کلاس" کو "ہُما کلاس" کہا جاتا ہے جہاں کھلی اور کشادہ سیٹوں کی وجہ سے مسافر پاؤں پھیلا کر نیم دراز ہو سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ کھانوں میں بھی خاصی ورائٹی ہوتی ہے... یعنی دو تین ڈشوں میں سے آپ اپنی پسند کی ڈش منتخب کر سکتے ہیں۔

آخر میں اس نئے ایئرپورٹ کے لئے میں اتنا ضرور کہوں گا کہ یہ دنیا کے صاف ستھرے ہوائی اڈوں میں سے ایک ہے۔ امیگریشن اور کسٹمز کے معاملات فوراً نمٹ جاتے ہیں اور تھکے ہارے مسافر کو مزید پریشان اور بیمار نہیں کیا جاتا۔

ایئرپورٹ پر تعینات اسٹاف نہایت خوش اخلاقی سے مسافروں کی مدد اور رہنمائی کرتا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ مسافروں کے بیٹھنے کے لئے جگہ جگہ کرسیاں نظر آتی ہیں تاکہ اپنی باری آنے تک مسافر آرام سے بیٹھے رہیں۔ جبکہ دنیا کے اکثر ہوائی اڈوں پر کسٹمز اور امیگریشن کے کمروں میں مسافروں کو کھڑا رہنا پڑتا ہے ۔ صرف شہر سے دور ہونے کی وجہ سے مسافروں کو کچھ تکلیف ضرور ہوتی ہے۔ ایئرپورٹ پر کام کرنے والے ایک شخص نے اس سلسلے میں بتایا تھا کہ شہر سے ایئرپورٹ تک چلنے والی ”میٹرو ٹرین“ کا آغاز جلد ہی ہونے والا ہے۔ اس سلسلے میں ہونے والا کام تکمیل کے مراحل میں ہے۔ اس کے بعد یہ ایئرپورٹ شہر کے وسط سے اس طرح منسلک ہو جائے گا جیسے نیویارک کا ایئرپورٹ "JFK" نیویارک شہر سے منسلک ہے۔ فی الحال شہر سے ایئرپورٹ آنے کے لئے ٹیکسی کا انتظام کرنا پڑتا ہے۔ جس کا کرایہ ایک لاکھ ریال یعنی دس ہزار تومان ہوتا ہے۔ یہ رقم امریکن بارہ ڈالر اور پاکستانی سات سو روپے کے مساوی ہے۔ بہرحال بعض ٹیکسی ڈرائیور پچاس یا سو روپے کم پر بھی آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اگر آپ تین افراد مل کر ایک ٹیکسی حاصل کرتے ہیں تو پھر فی کس کرایہ خاصا سستا بنتا ہے، تقریباً دو سو روپے فی مسافر! یہ کرایہ کراچی سے بھی سستا ہے۔ کیوں کہ کراچی میں میٹرو ٹیکسی والے ایئرپورٹ سے صدر تک کا کرایہ تین سو روپے وصول کرتے ہیں۔

ایران کے ہوائی جہاز کے بزنس کلاس کا نام ”ہما“ ہے۔ اس کے علاوہ ایران ایئر کے نام کے آخر میں ہُما لکھا ہے اور ساتھ ہی ایک پرندے کی تصویر ہے۔ ہُما دراصل ایک دیومالائی پرندہ ہے جس کی تاریخ ایران کے قدیم شہنشاہوں Achaemenid سے وابستہ ہے۔ تخت جمشید Persepolis کے محلات اور دیگر عمارات کے ستونوں پر اس پرندے کی تصویر نظر آتی ہے۔ ایرانی لوک کہانیوں کے مطابق بادشاہ کے مرنے کے بعد یہ پرندہ اڑ کر جس کے بھی سر پر بیٹھ جاتا تھا تو اسے بادشاہ منتخب کیا جاتا تھا۔ بہرحال پرشین آرٹ میں اس خیالی پرندے کی بڑی اہمیت ہے۔ ”شاید“ اسی لئے ایران ایئر والوں نے اپنی ہوائی کمپنی کا نشان ”ہُما“ منتخب کیا ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور خاص بات ...ایئر ایران کے فارسی نام ”ہوائی پیمائی ملی ایران“ کا مخفف بھی ”ہما“ بنتا ہے۔

آخرکار ہمارے گروپ کے تمام افراد ایئرپورٹ سے باہر آکر یکجا ہوگئے۔ اس وقت ایئرپورٹ کے باہر کوئی بھی ٹیکسی موجود نہیں تھی۔ کچھ فاصلے پر دو بسیں کھڑی نظر آرہی تھیں۔ جن میں ایک بڑی اور ایک چھوٹی (منی بس) تھی۔ بڑی بس ہم سب کے لئے کافی تھی لیکن ان میں چھت پر یا نیچے سامان رکھنے کی جگہ نہیں تھی۔ سامان کو بس میں اپنے ساتھ رکھنا تھا۔ اس لئے ہمارے ٹور آرگنائزر کرنے والوں کو دونوں بسیں کرائے پر حاصل کرنی پڑیں۔ تیس سیٹوں والی بس میں ٹور انچارج محمد علی، میں اور ایک فیملی، جس میں میاں بیوی اور چار بچے شامل

تھے، سماسکے! ان کے ساتھ ان کے وزن اور سائز سے بڑے کنگ سائز بیگ تھے جو مہینے بھر کے سفر کے لئے مناسب نہیں تھے بلکہ کسی بھی ملک میں دو یا تین سال ملازمت کرنے والے افراد ایسے بیگ عموماً اس وقت اپنے ساتھ لےتے ہیں جب وہ ملک چھوڑتے ہیں۔

سب کو اس بات پر حیرت ہو رہی تھی کہ انہوں نے اتنے بڑے بیگ اپنے ساتھ کیوں لئے ہوئے ہیں؟ ان بیگوں کو اٹھانے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ تک لے جانے میں وہ خود پریشانی کا سامنا کر رہے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ انہوں نے ان میں صبح شام بدلنے کے لئے لباس اور کھانے پینے کی چیزیں بھری ہوئی تھیں۔ سفر کے لئے نکلنے والا مسافر سکون سے تب ہی رہ سکتا ہے جب وہ اپنے ساتھ کم سے کم سامان (بوجھ) رکھتا ہے۔ خاص طور پر ایران جیسے ملک میں، جہاں خواتین کے لئے دو سوٹ کافی ہوتے ہیں۔ کیونکہ انہیں ہر وقت پردے میں ملفوف رہ کر چلنا پڑتا ہے۔ وہاں کون یہ دیکھتا ہے کہ کس نے کس قسم کا سوٹ پہنا ہوا ہے۔ کڑھائی اور سلائی کیسی ہے، سوٹ استری شدہ ہے یا بغیر استری کے ہے...

مردوں کے لئے میرا مشورہ ہے کہ وہ سفر کے دوران دو یا زیادہ سے زیادہ تین سوٹ اپنے ساتھ رکھیں۔ شلوار قمیض کی جگہ ٹراؤزر کا انتخاب بہتر رہے گا۔ اس لباس میں خاصا آرام محسوس ہوتا ہے اور اس کی جیبوں میں آپ سفری کاغذات، روپے اور پاسپورٹ وغیرہ کو سہولت کے ساتھ رکھ سکتے ہیں۔ یہاں کے مقامی ایرانی باشندے بھی عام طور پر آپ کو ٹراؤزر پہنے نظر آئیں گے۔ آپ کو یہاں ہزاروں میں ایک ایسا شخص نظر آئے گا جو شلوار سوٹ میں ملبوس ہوگا۔ معلوم کرنے پر وہ شخص خیرپور، ملتان یا سبی کا رہائشی ثابت ہوتا ہے۔

کھانے پینے کے معاملے میں بھی ایران خاصا بہتر ملک ہے۔ انڈیا اور ملائیشیا بھی اس سلسلے میں بہتر ہیں لیکن انڈیا میں کہیں کہیں غیرمعیاری اور غیرصحت مند کھانے کا خوف بہرحال رہتا ہے۔ ملائیشیا میں حلال کھانا عام ملتا ہے لیکن وہاں روز بہ روز مہنگائی میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ ایران میں گو کہ چندگنی چنی ڈشز دستیاب ہوتی ہیں لیکن صفائی ستھرائی کا خاص خیال رکھا جاتا ہے اور ان کی قیمت بھی خاصی مناسب ہے۔ زعفران کے استعمال کے سبب کھانوں میں ایسی خوشبو ہوتی ہے کہ محض اُبلے ہوئے چاول بھی اچھے لگتے ہیں۔ لہٰذا ایسے ملک میں آنے کے لئے اپنے گھر سے کھانوں کے سیلڈ ٹن یا پیکٹ ساتھ لے کر چلنا حماقت کے سوا کچھ نہیں۔

ہمارے گائیڈ محمد علی نے دونوں بسوں کے ڈرائیوروں کو جلد تہران کے مہرآباد ایئرپورٹ پہنچنے کی ہدایت کی۔ وقت بہت کم رہ گیا تھا۔ کیونکہ ہمیں مشہد جانے کے لئے دوسری فلائٹ میں سوار ہونا تھا جو مہرآباد ایئرپورٹ سے پرواز کرنے والی تھی۔ بڑی بس کے پیچھے چھوٹی بس روانہ ہوگئی... سڑکیں کشادہ اور روشن تھیں ان پر بسیں گویا تیرتی ہوئی جارہی تھیں۔

دس پندرہ کلومیٹر کا سفر طے ہوا تھا کہ ہمارے ساتھ بیٹھے ہوئے خاندان میں کچھ ہلچل سی پیدا ہوئی۔ پھر گویا افراتفری سی مچ گئی۔ معلوم ہوا کہ سوئٹر اور جیکٹوں کا تھیلا وہ لوگ ایئرپورٹ پر بھول آئے ہیں۔ وہ ایک دوسرے پر الزام لگاتے رہے کہ اس نے غیرذمہ داری کا ثبوت دیا اور اپنا سامان گم کردیا۔ موسم خاصا سرد تھا اور وہ اس لئے بھی پریشان تھے۔ انہوں نے محمد علی سے کہا کہ بس کو واپس ایئرپورٹ لے چلیں۔ شاید ان کا سامان مل جائے... میں یہ بتانا بھول گیا کہ اس بس میں ہمارے علاوہ ایک اور خاتون بھی سوار تھیں جو ایران کے اس سفر پر تنہا نکلی تھیں۔ وہ خود تو ہماری بس میں سوار تھیں لیکن ان کا بیگ آگے چلنے والی بڑی بس میں رکھا تھا۔ بس کی واپسی کا سن کر وہ پریشان ہوگئیں۔

"میرے بیگ کا کیا ہوگا جو اگلی بس میں ہے۔" خاتون نے دہائی دی۔ "مہرآباد ایئرپورٹ پر سب لوگ اپنا سامان اتاریں گے اور بس واپس چلی جائے گی... میرا بیگ کون سنبھالے گا؟"

میں سوچنے لگا کہ اب کیا ہوگا؟ گروپ کے ساتھ چلنے والا گائڈ بھی عجیب مشکل میں پڑگیا تھا۔ آخرکار محمد علی نے اس خاتون کو سمجھایا "دیکھئے محترمہ! تمام مسافر اپنے سامان کے ذمہ دار خود ہیں۔ میں بھی اپنا ہی سامان سنبھال سکتا ہوں، کسی اور کا نہیں۔ میرا کام بس مہیا کرنا اور اس کا کرایہ ادا کرنا ہے۔" پھر اس نے ان لوگوں سے جن کے سوئٹر وغیرہ پیچھے ایئرپورٹ پر رہ گئے تھے کہا:

"ہم اس وقت واپس نہیں جاسکتے۔ اس ہائی وے پر آپ کو کہیں بھی "یوٹرن" کا کٹ نظر نہیں آئے گا۔ ہم واپس جانے والی سڑک پر جا ہی نہیں سکتے۔ دوسری بات یہ کہ اگر ہم آپ کے سوئٹر اور جیکٹوں کا تھیلا لینے کے لئے واپس گئے بھی تو ہمارے گروپ کے تیس افراد مشہد جانے والی پرواز مِس کر بیٹھیں گے۔ اب بہتر صورت یہی ہے کہ مشہد پہنچ کر نئے سوئٹر خریدیئے گا۔ ایران کے خوبصورت اور گرم سوئٹر آپ کو کہیں نہیں ملیں گے، خاص طور پر اتنی کم قیمت میں"!

خمینی ایئرپورٹ سے تہران تک ۳۰ کلومیٹر کا فاصلہ پینتالیس منٹ میں طے ہوگیا تھا۔ لیکن تہران شہر کے ایک لارنس روڈ اور گارڈن جیسے علاقے سے گزر کر مہرآباد ایئرپورٹ تک پہنچنے میں نصف گھنٹہ صرف ہوگیا۔ ایئرپورٹ پہنچ کر جب ہم نے بس میں سے اپنا سامان اتارا تو بڑے بیگوں کے نیچے سے وہ تھیلا برآمد ہوگیا جس کے لئے مسافر خاندان کے افراد یہ گمان کر بیٹھے تھے کہ گم ہوگیا ہے۔ یعنی خمینی ایئرپورٹ پر اٹھانے سے رہ گیا۔ وہ تھیلا خود ان ہی کے بیگوں کے نیچے رکھا ہوا تھا۔ سب نے شکر ادا کیا... اس پر نہیں کہ سوئٹر اور جیکٹوں کا تھیلا مل گیا، بلکہ اس بات پر کہ محمد علی نے عقلمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہیں سمجھایا تھا اور بس کو واپس ایئرپورٹ کی جانب نہیں لوٹایا۔ اس صورت میں تمام مسافر مشہد جانے والی پرواز میں سوار ہونے سے رہ جاتے۔